ندا فاضلی

چہرے

ندا فاضلی

معیار پبلی کیشنز

CHEHREY

BY:

NIDA FAZLI

نام کتاب	:	چہرے
مصنف	:	ندا فاضلی
پہلا ایڈیشن	:	۲۰۰۲ء
مطبوعہ	:	عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی
قیمت	:	دوسو روپے

معیار پبلی کیشنز

کے-۳۰۲/تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۱۱۰۰۳۱

میں شکر گذار ہوں:

جناب فضیل جعفری

جناب عشرت قادری

جناب اجلال مجید

جناب ندیم صدیقی

اور جناب شاہد ماہلی کا

جن کے تعاون نے اس کتاب کی تکمیل میں میرا ساتھ دیا۔

اپنے والد دعا ڈبائیوی کے نام

جن کی وجہ سے مجھے

اس کتاب میں شامل بیشتر شاعروں کو

دیکھنے اور سننے کی سعادت نصیب ہوئی

فہرست

نوح ناروی

ناخدائے سخن۔ نوح ناروی

اعجاز نوح، نوح ناروی کا تیسرا دیوان ہے۔ اس میں ان کی ایک تصویر ہے۔ وہ جامدانی کی شیروانی میں ملبوس ہاتھ میں چھڑی لیئے بیٹھے ہیں۔ ان کے دائیں بائیں دو نوجوان کھڑے ہیں۔ تصویر کے نیچے ایک شعر ہے۔

اے نوح آس پاس مرے فرخ وسعید
دائیں طرف سہیل ہیں بائیں طرف مجید

یہ فرخ وسعید ان کے نواسے تھے، جو خود بھی شعر کہتے تھے۔ ان میں چھوٹے سہیل تو آخری عمر کے ہر مشاعرہ میں ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اعجازِ نوح سے پہلے نوح صاحب کے دو دیوان سفینۂ نوح، اور طوفانِ نوح کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔ ان میں ہر دیوان الف سے یے تک کی ردیفوں سے مکمل ہے۔ اور ضخامت کے لحاظ سے بھی سینکڑوں غزلوں پر مشتمل ہے۔

میں نے انہیں اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ اپنے گھر میں اس وقت وہ بالکل ایسے ہی تھے جیسے اعجاز نوح کی تصویر میں نظر آتے ہیں۔ میرے والد دعا ڈبائیوی ان کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں تھے۔ اور اُن کے بعد ان کے سند یافتہ جانشین بھی تھے۔ ان دنوں استادی شاگردی محض ایک روایت ہی نہیں تھی رشتے کی عقیدت بھی تھی۔ اپنے استاد کے ساتھ ان کی عقیدت میرے بچپن کی ایک ایسی یاد ہے جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

میری والدہ نے میری بڑی بہن کے لئے اپنی بڑی بہن کے منجھلے بیٹے کا انتخاب کیا تھا۔ منگنی کی رسم کے لئے لڑکے کے ساتھ اس کی ماں دہلی سے گوالیار آئی تھی۔ رسم کی ایک رات پہلے گفتگو کے دوران اس لڑکے نے دہلی کے کسی مشاعرہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ نوح صاحب کو پسند نہیں کیا گیا اور میں نے اور میری ساتھیوں نے انہیں خوب ہوٹ کیا۔ اپنے ہونے والے داماد کے منہ سے اپنے استاد کی شان میں اس گستاخی پر اس وقت تو وہ خاموش رہے۔ لیکن دوسرے دن انہوں نے یہ کہہ کر منگنی توڑ دی کہ جو لڑکا میرے استاد کا احترام نہیں کرسکتا وہ میری بیٹی کے لیے کیسے موزوں ہوسکتا ہے۔ ان کے اس فیصلہ کو نہ میری ماں کے آنسو بدل سکے نہ لڑکے کی لگاتار معافی نے تبدیل کیا۔ وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔ اور دو زندگیاں قریب آتے آتے مختلف سمتوں میں مڑ گئیں۔

نوح صاحب کو بھی اپنے استاد حضرت داغ سے ایسی ہی عقیدت تھی۔ داغ صاحب بھی جس کو شاگرد بناتے تھے اس سے پہلے اپنے استاد ذوق، اور ذوق کے استاد شاہ نصیر کی فاتحہ دلواتے تھے۔ اور اسی کو اپنا معاوضہ ٹھہراتے تھے۔

نوح صاحب، داغ کے کلام کے حافظ تھے۔ انہیں گل زار داغ، آفتاب داغ، فریاد داغ، مہتاب داغ اور یادگار داغ پورے کے پورے زبانی یاد تھے۔ داغ نے ان کی یہ خصوصیت دیکھ کر کہا تھا۔ کلام الٰہی کے حافظ تو بہت دیکھے تھے، آج کلام داغ کا حافظ بھی دیکھ لیا۔ نوح صاحب کو کلام داغ کے علاوہ اور بہت سے دوسرے اساتذہ کا کلام بھی از بر تھا۔ وہ شعر گوئی کے لئے اسے ضروری سمجھتے تھے۔ بعد میں وہ خود بھی جسے شاگرد بناتے تھے۔ اس سے بھی استادوں کے کم سے کم پانچ ہزار اشعار یاد کرنے کی مشقت کرواتے تھے۔ ان کے اس مشورہ کی اہمیت اور منطق پہلے تو سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ لیکن بعد میں، عمر کے ساتھ اس کی افادیت کا اندازہ ہوا۔ استادوں کے وہ شعر جو زبان و بیان سے درست قافیہ ردیف سے چست ہوتے ہیں جب دماغ کے خلیوں میں بس جاتے ہیں تو وہ نہ صرف شاعر کی شعری رہنمائی فرماتے ہیں اسے وہ آداب بھی سکھاتے ہیں جو ادب کی تفہیم کی ضروری شرطیں ہیں۔

نوح صاحب کی ولادت نارہ کے ایک جاگیر دار مولوی عبدالمجید کے یہاں ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ لیکن ابھی مشکل سے چار سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد کی اچانک رحلت اور تین سوتیلی ماؤں کی مسلسل عداوت نے ریاست کو مصیبتوں کا گہوارہ بنا دیا۔ ان مصیبتوں کو مسرتوں سے بدلنے میں کافی عرصہ بیت گیا۔ ان کی تعلیم انہیں الجھنوں کا شکار رہی۔ حالات جب ہموار ہوئے تو انہوں نے اپنی محنت اور مسلسل مطالعہ سے اس کمی کو پورا کیا اور اردو، فارسی میں خاطر خواہ دسترس حاصل کی۔

نوح ناروی نے اپنے ادبی سفر کا آغاز نثر سے کیا تھا۔ شاعری کی ابتدا سے پہلے وہ دو ناول لکھ چکے تھے۔ ایک ثریا اور دوسرا ہائے ستم، ثریا تو چھپ گئی لیکن دوسرے کے شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اور اسے خود ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ ان دو ناولوں کے علاوہ ایک اور بے نام کتاب ہے جس میں متروک شدہ الفاظ کی طویل فہرست کے ساتھ عروض اور علم قوافی کے متعلق بحثیں شامل ہیں۔ یہ کتاب بھی ان کی شعری مصروفیات کی وجہ سے تین سو صفحات تک نامکمل ہو کر رہ گئی اور شائع نہیں ہو سکی۔

نوح صاحب پابندی سے ایک مقررہ وقت پر شعر کہنے کے عادی تھے۔ یہ وقت مغرب اور عشاء کے درمیان میں ہوتا تھا۔ شعر کہتے وقت پلنگ یا آرام کرسی پر دراز ہوتے تھے اور حقے کے کشوں کے ساتھ شعر مکمل ہوتے رہتے تھے۔ کبھی کوئی خادم جو اس کام کے لئے مخصوص تھا وہ تحریر کرتا تھا اور کبھی وہ خود بار بار اٹھ کر کاغذ پر اتارتے رہتے تھے۔ وہ ایک ساتھ ایک ہی زمین میں، مطلع اور مقطع کے ساتھ کم سے کم دو تین غزلیں کہتے تھے۔

داغ دہلوی کے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں اقبال اور سیماب بھی تھے جو داغ کے شاگرد ہو کر بھی اپنے انداز اور اسلوب کے لحاظ سے مختلف تھے اور وہ بھی تھے جنہوں نے داغ کے رنگ سخن میں استادی کے کمال دکھائے تھے۔ داغ کا انتقال ۱۹۰۵ میں ہوا۔ اس وقت ان کے شاگردوں میں ان کی جانشینی کے حق دار بہت سے تھے۔ ان میں چند اہم نام،

نارائن پرشاد ہر، وحید الدین، بیخود دہلوی، نسیم بھرت پوری، آغا شاعر، گوہر رام پوری، حب لال رعد، متین مچھلی شہری، وفا مارہروی، لبھو رام جوش، بشیر رام پوری فضل رب باغ تھے۔ یہ سب استاد شعرا اور کئی کئی مجموعوں کے خالق تھے لیکن سائل دہلوی نے جانشینی کے اس تاج کے لئے جس شاگرد داغ کا انتخاب کیا وہ نوح ناروی تھے۔ سائل نے اپنی تحریری سند میں لکھا تھا۔

''میں، بہ اعتبار صحیح پیروی مذاق سخن حضرت بلبلِ ہندوستان آپ کو جانشینِ داغ سمجھتے ہوئے مبارک دیتا ہوں''۔

نوح ناروی اپنی مشاقی اور شعری سرمائے کے اعتبار سے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ زود گو تھے۔ جہاں تک ''صحیح پیروی مذاق سخن حضرت بلبل ہندوستان'' کا سوال ہے اس کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ نوح داغ کی شاعری کے اسی رنگ کے نمائندہ ہیں جس کی طرف حالی پانی پتی کے اعتراض پر داغ نے اشارہ کیا تھا۔ داغ نے کہا تھا:

''میں نے اپنی شاعری کے ذریعہ صرف قلعہ معلی کی زبان کا تحفظ کیا ہے۔ اسی کو اپنی منزل بنایا ہے''۔ لیکن داغ صرف زبان و بیان کا چٹخارا نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں یہ اور بات ہے داغ کے کلام کا ڈھنگ کا انتخاب ہو سکا اور نہ ان کی دیگر شعری خصوصیات اجاگر ہو پائیں ۔نوح نے اس بہت کچھ میں سے داغ کی زبان کی فصاحت اور سلاست کو اپنا شعری معیار بنایا اور اسی دائرہ میں استادی کا کمال دکھایا۔ داغ کی طرح زبان کو زندگی کا آئینہ نہیں بنایا۔ نوح کی شاعری کا مجموعی مزاج زبان کی صناعی ہے۔ محاوروں کی رعنائی ہے اور قافیہ ردیف کی چوکسائی ہے۔

وہ کہتے ہیں آ و میری انجمن میں مگر میں وہاں اب نہیں جانے والا
کہ اکثر بلایا، بلا کر بٹھایا، بٹھا کر اٹھایا اٹھا کر نکالا۔
گو ساتھ اٹھا، ساتھ چلا ساتھ پھرا میں
سائے کی طرح پھر بھی رہا ان سے جدا میں

کبھی عشق میں انقلاب ایسا آئے، محبت کبھی یہ تغیر دکھائے
بدل جائے دل اور دل ہو بدل کر ہمارا تمہارا، تمہارا ہمارا

جو وہ غم نہ رہا تو وہ دل نہ رہا، جو وہ دل نہ رہا تو وہ ہم نہ رہے
جو وہ ہم نہ رہے تو وہ تم نہ رہے جو وہ تم نہ رہے تو مزہ نہ رہا

نوح صاحب اپنے رنگ سخن کے ہی استاد نہیں تھے ان کے پڑھنے کا انداز بھی استادانہ تھا۔ وہ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ آواز زیادہ بھاری نہیں تھی۔ لیکن ہاتھوں کے اشاروں، آنکھوں کے گھماؤ کے ساتھ مصرعوں کو مناسب جگہوں پر ٹھہرا کر آگے بڑھاتے تھے۔ ردیف وقافیہ بولتے ہوئے ہوتے تھے۔ دوسرا مصرع آدھا ہی پورا ہوتا تھا کہ سامعین باقی کا حصہ بیساختہ بول پڑتے تھے۔ اور داد کے شور میں نوح صاحب بار بار گردن گھما گھما کر ہاتھ کو ماتھے سے لگاتے نظر آتے تھے۔ رواں دواں چست مصرعے، کھنکتے ہوئے قافیے، شگفتہ ردیفوں، سہل ممتنع کا اعجاز اور اس پر شعر کو تصویر بنا دینے کا انداز، دیکھتے دیکھتے مشاعرہ میں ہنگامہ برپا ہو جاتا تھا۔ پہلے کے استاد صرف کلام کی ہی اصلاح نہیں کرتے تھے۔ شاگردوں کو شعر پڑھنے کے طور طریقے بھی سکھاتے تھے۔ داغ صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ شعر اس طرح سناتے تھے کہ شعر زبان سے نکلتے ہی سامعتوں پر نقش ہو جاتے تھے۔ نوح، کافی دنوں حیدرآباد میں داغ کے مہمان رہے تھے۔ انہوں نے استاد کے کلام کو ہی اپنی شعری منزل نہیں بنایا تھا ان کے تحت لفظ کے انداز کو بھی اپنایا تھا۔ نوح صاحب اپنے انداز اور شعر کی ڈرامائی پیش کش کی وجہ سے مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔

نوح نے داغ کی زبان کو زیادہ سلیس اور بول چال کے قریب کیا ہے۔ ان کی شعری زبان، سند کا درجہ رکھتی ہے۔ داغ نے ان کی اسی مہارت پر انہیں ناخدائے سخن کے لقب سے نوازا تھا۔ ۱۹۰۴ میں داغ نے نوح کے بارے میں لکھا تھا۔

''نوح کے کلام کی وقعت عین میرے کلام کی وقعت اور ان کی عزت عین میری عزت ہے۔ انہوں نے ایسی ترقی کی کہ میرے کلام میں اپنا کلام ملادیا میرے شاگرد اس بات کا لحاظ رکھیں اور وہ میرے احباب جو میرے کلام کو پسند فرماتے ہیں ان کے کلام کو بھی اسی نگاہ سے دیکھیں!''

نوح صاحب کی مشاقی کا یہ عالم تھا کہ وہ شعر بھی نثر کی طرح لکھتے تھے۔ایک بار، ایک مشاعرہ میں، کسی نے اپنی کاپی ان کے سامنے کرتے ہوئے پتہ تحریر فرمانے کی درخواست کی تھی۔ نوح صاحب نے قلم لے کر بنا سوچے پورے ایڈریس کو شعر بنادیا۔

جو آنا ہے ان کو تو اے نوح آئیں، طرف، راستہ فاصلہ کچھ نہ پوچھیں
چڑھیں ریل میں اور پہونچیں سرا تھوں، سرا تھوں سے نومیل دکھن ہے نارا

قدرت نے پیدائش سے رئیس بنایا تھا۔ آرام و آسائش کی زندگی کا اثر ان کی شعر گوئی پر بھی نظر آتا ہے۔ جیسا کہا گیا ہے وہ پابندی سے روزانہ شعر کہتے تھے۔ شعر بہت تیز کہتے تھے، کبھی اتفاق سے کہیں اٹکتے تھے، تو زیادہ الجھتے نہیں تھے پہلے مصرع میں سے ہی دوسرا مصرع آسانی سے نکال لیتے تھے تھے۔ اور شعر پورا کردیتے تھے۔ ان کے اس طرح کے کچھ شعر یوں ہیں۔

جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے،
جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے

فکر و تشویش غور، عشق میں کیا
فکر، تشویش غور، کچھ بھی نہیں

جو کچھ بھی ملا ہے وہ خدا ہی سے ملے گا
جو کچھ بھی ملا ہے وہ خدا ہی سے ملا ہے

شروع سے ثقل سماعت کے شکار تھے۔ بڑھتی عمر میں اس مرض میں اور اضافہ ہوا۔ اپنی کمزور سماعت کی وجہ سے انہیں دوسروں کی سماعتوں پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ اس شک کی بنا پر اکثر شعروں میں وہ ہم معنی الفاظ اس طرح کھپاتے تھے کہ سننے والا چاہے کہیں سے سنے شعر کا مفہوم واضح ہو جاتا تھا۔ ان کے اس قسم کے اشعار مشاعروں میں بہت پسند کیے جاتے تھے۔

آپ بہکانے میں لوگوں کے نہ آیا کیجئے
جانچا، پرکھا، دیکھا بھالا سوچا سمجھا کیجئے

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے
دیکھ، سن، سوچ کہا مان بہت مشکل ہے

تیری تند خوئی تیر کینہ جوئی، تیری کج ادائی، تیری بے وفائی
بلا ہے، ستم ہے غضب ہے قیامت دہائی دہائی دہائی

نوح صاحب کی شعری خصوصیات میں ان کے مقطع بھی بہت اہم ہیں، مومن خاں کے بعد وہ اکیلے شاعر تھے جو اپنے تخلص کی تلمیحی رعایت سے مقطعوں میں وہ نئے نئے معنی پیدا کرتے تھے۔ انہیں اپنی زبان دانی اور داغ دہلوی کی تقلید پر فخر تھا۔ ایک مقطع میں انہوں بڑی خوبصورتی سے اس کا اظہار بھی کیا تھا۔

اے نوح دمِ طوفان سخن جانچیں پرکھیں یاران سخن
میں بھی ہوں مقلد دلی کا میری بھی زبان ٹکسالی ہے

ناطق گلاؤٹھی

استاذ الاساتذہ ناطق گلاوٹھوی

نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے عہد میر کے دو بڑے حادثے تھے۔ ایک ان کے لڑکپن کا سانحہ تھا، دوسرا ان کی جوانی کا حادثہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں مغل سلطنت کے زوال کے دنوں میں جو تباہی مچائی تھی اس کے: میر (پیدائش ۱۷۲۴ء) عینی شاہد رہے تھے میر نے ذکر میر میں اس کا آنکھوں دیکھا حال نہایت دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔

''صبح کو جو گویا صبح قیامت تھی، تمام فوج شہر پر ٹوٹ پڑی اور قتل و غارت گری میں لگ گئی۔ شہر کے دروازوں کو توڑ ڈالا، لوگوں کو قید کر کے بہتوں کو جلا دیا، نہ جانے کتنوں کے سر کاٹ دیے۔ تین دن رات یہ مظالم جاری رہے۔ اس دور کی دہلی میر کے اشعار میں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہے

دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گذرا

کن نیندوں اب تو سوئی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

اب خرابہ ہوا جہاں آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

احمد شاہ ابدالی کی فوج میں قتل و غارت گری کرنے والے سپاہیوں کے ساتھ ایک صوفی

صفت شخصیت' سید منہاج الدین کی بھی تھی ۔ ابدالی دہلی کو لوٹ کے واپس چلا گیا۔ لیکن منہاج الدین خود دلٹ کے ہمیشہ کے لئے حضرت نظام الدین کی بستی کے ہو گئے ۔ مولانا ناطق اسی بزرگ کی ساتویں نسل کے چراغ تھے ناطق ابدالی کے حملہ کے تقریباً ۱۲۵ سال بعد موجودہ مہاراشٹر کے ایک علاقہ کامٹی (ناگپور) میں ۱۱ نومبر ۱۸۸۶ میں پیدا ہوئے گلاؤٹھوی اتر پردیش سے ان کا تعلق ہندوستان میں ان کے شجرہ کی چوتھی نسل میں سید عنایت اللہ کے واسطے سے تھا جنہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تھی۔ عنایت اللہ وطن پرست انسان تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی شمولیت پر انگریز حکومت نے انہیں پھانسی کی سزا دی تھی۔ ناطق صاحب نے اس سزا کو اپنی وطن پرستی کے اعزاز کے طور پر اپنایا اور ناگپور میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو ہمیشہ گلاؤٹھوی کہلوایا۔

ناطق صاحب کو پہلی بار میں نے گوالیار میں دیکھا تھا۔ وہ آئے تھے مشاعرہ کے لئے۔ لیکن میرے والد اور دوسرے مقامی شعراء کے اصرار پر کئی دن ٹھہرے تھے ان دنوں گوالیار' رام پور حیدرآباد بھوپال اور لکھنؤ کی طرح ایک اہم کلاسکی مرکز تھا۔ مضطر خیرآبادی' جانشین داغؔ نارائن پرشادؔ مہر سروپ نارائن ایمن، کپتان تاباں، شوناتھ کول شاکر اور حب لال رعد اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ان کے بعد ساحل حیدری' جان محمد انور چاند نارائن بکسر' اماشنکر شاداں ضیاء عباسؔ' جاں نثار اختر' فیاض الدین فیاض' رضا قریشی' مدہوشؔ' ریاضؔ' جیوری' دعاؔ' ڈبائوی جیسے اساتذہ کی آوازوں سے ادبی فضا روشن تھی۔

دل مضطر ہلاک بے حجابی ہائے دلبر ہو
گرے مجھ پر جو بجلی وہ ترے قد کے برابر ہو

کپتان تاباںؔ

دل سی شے ہم آپ کو دیدیں منانے کے لئے
ایک دنیا چاہیے اک دل بنانے کے لیے

محمد اصغر شاداںؔ

جی لیے چار دن جوانی میں

زندگی عمر بھر نہیں ہوتی

ضیا، عباس ہاشمی

یہ بھی نہ جاسکے گی اگر وہ نہ آئیں گے
دامن پکڑ لیا ہے شب انتظار کا

مدہوش گوالیاری

انہیں بزرگوں میں ایک نام نواب حکیم احمد صاحب کا بھی تھا۔ جو سندھیا اسٹیٹ کے سابق وزیر تھے۔ شاعری کے ساتھ ان کا بڑا کارنامہ چاروں ویدوں کا اردو ترجمہ تھا جو ویدی لٹریچر کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا تھا۔ ان کی سرپرستی میں ماہانہ طرحی نشستیں ہوتی تھیں۔ جن میں دل شاہجاںپوری نوح ناروی، سیماب، بے خود، مانی جائسی وغیرہ شریک ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی کم عمری کے دنوں میں نوح ناروی اور مانی جائسی کو بزم اردو کی ان نشستوں میں دیکھا اور سنا تھا مانی صاحب نہایت دبلے پتلے، کمزور جسم کے بزرگ تھے۔ گردن تک بند بٹن کی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ میں ملبوس جب وہ شعر سناتے تھے تو تیر کمان بن جاتے تھے۔ شعر کے ہر لفظ کے ساتھ ان کے گلے کی رگیں پھولتی جاتی تھیں، چہرے کی جھریاں کپکپاتی جاتی تھیں، سانسیں تھم تھم کر واپس آتی تھیں اور آواز، ترنم میں جگہ جگہ ٹوٹ کر جڑتی جاتی تھی۔ ان کی شعر خوانی کو سامعین سماعتوں کے بجائے بصارتوں سے سنتے تھے۔ ان کو اس عالم میں ایک بار پڑھتا دیکھ کر نوح صاحب نے آہستہ سے کہا تھا۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔

انہیں نشستوں کا ایک واقعہ بزرگوں کی زبانی سنا تھا۔ نارائن پرشاد مہر اور مضطر خیرآبادی حیات تھے۔ مضطر امیر مینائی کے شاگرد تھے اور مہر داغ کے۔ دونوں اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ طرحی نشستوں میں شریک ہوتے تھے اور ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے تھے۔ جب مضطر کے گروہ کا کوئی شاعر کلام سناتا تھا تو مہر کے حلقہ میں سناٹا چھا جاتا تھا اور جب مہر کی صف سے کسی کو

مدعو کیا جاتا تھا تو مضطرؔ سمیت سب پر پالا پڑ جاتا تھا۔ مہرؔ کی طرحی غزل کا مطلع تھا۔

اسیری میں، جنوں نے تو کیے زنجیر کے ٹکڑے
کھلی جب بند آنکھیں تو ملے تعبیر کے ٹکڑے

مہرؔ صاحب کی پوری غزل مطلع سے مقطع تک استادانہ تھی۔ لیکن معاصرانہ چشمک کی وجہ سے کسی کے منہہ سے واہ نہیں نکلی۔ مہرؔ کے بعد مضطرؔ کو زحمت کلام دی گئی۔ مضطرؔ کے پڑھنے کا انداز کہتے ہیں نہایت ساحرانہ تھا۔ وہ شعر نہیں پڑھتے تھے۔ سنا ہے ہاتھوں کے اشاروں' آنکھوں کی حرکتوں اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے اس کی تصویر بناتے تھے۔ جب مضطرؔ غزل کے اس شعر پر آئے۔

زمانہ روٹیوں پر فاتحہ مُردوں کی دیتا ہے
ہمارے واسطے لایا ہے وہ شمشیر کے ٹکڑے

تو مہرؔ صاحب ساری مُعاصرانہ چشمک کو بھول کر بے تحاشہ داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ جب نشست کے بعد ان کے شاگردوں نے انہیں وہی شعر سنا کر پوچھا کہ آپ کو اس میں کون سی خوبی نظر آئی جو اتنی داد دی آپ نے۔ مہرؔ صاحب کا جواب تھا۔ اس وقت تو شعر واقعی بہت لغو لگ رہا ہے مگر اس وقت کم بخت نے اسے ایسے پڑھا کہ مجھے اپنی بیوی کی علالت یاد آ گئی اور میں اپنے آپ کو نہیں روک سکا۔ اس زمین میں مولانا ناطق کا مطلع تھا۔

حسینانِ جہاں ہیں حسن عالم گیر کے ٹکڑے
مرقع میں ہیں سارے ایک ہی تصویر کے ٹکڑے

ناطقؔ صاحب دوسری بار گوالیار تشریف لائے تھے۔ پہلی بار جب وہ آئے تھے تو ان پر جوانی کا خمار تھا۔ اس بار ضعیفی کے ساتھ شعر وسخن کا اعتبار تھا۔ ان کے اعزاز میں کئی جلسے ہوئے اسکولوں اور کالجوں میں انہیں مدعو کیا گیا۔ گوالیار میں ان کے مختصر سے قیام نے ادبی ماحول کو گفتگو کے نئے موضوعات فراہم کیے تھے۔ جو ان کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی دنوں دہرائے گئے

تھے۔ مشاعرہ میں انہیں شکیل بدایونی کے بعد زحمت کلام دی گئی تھی۔ شکیل سے وہ ان کے ایک فلمی نغمہ کی وجہ سے ناراض تھے۔ ناطق صاحب اس میں عروضی جھول دکھار ہے تھے اور شکیل ''چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو'' میں ایک رکن کی کمی کو فلمی موسیقی کی مجبوری بتارہے تھے۔ بات شروع ہوئی تھی مشاعرے سے پہلے اور وہیں ختم بھی ہوگئی تھی۔ لیکن وہ اسے اب تک نہیں بھولے تھے۔ انہوں نے مائک کے سامنے بیٹھتے ہی اپنی پاٹ دار آواز میں جو پہلا شعر پڑھا تھا اس کا تخاطب شکیل سے ہی تھا۔

آج کل نغمہ پہ ہے ناطق مدار شاعری
شاعری پر پہلے سنتے تھے ' مدار نغمہ ہے

سامعین ان کے طنز کو پہچان گئے تھے۔ اس لئے مشاعرہ پہلے شعر سے ہی داد و ستائش کے شور سے گونجنے لگا۔ اور شکیل کا رومال بار بار پیشانی کے پسینے کو پوچھ رہا تھا۔

ایک محفل میں ان کا کلام بھی سنا جارہا تھا اور ان سے سوالات بھی پوچھے جارہے تھے۔ یہ ون مین شو ناطق صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا۔ ان سوالات کرنے والوں میں ایک صاحب حالی کی زبان میں داغ کے کلام پر تنقید کررہے تھے اور سوال پوچھ رہے تھے۔ اس کا سوال سنتے ہی ناطق نے بھاری بھرکم آواز میں دریافت کیا۔

صاحبزادے آپ کی عمر کیا ہوگی؟ اس غیر متوقع سوال پر وہ پہلے کچھ گھبرایا پھر جواباً کہا: میری عمر تیس سال ہے حضرت!! لیکن عمر سے آپ کے جواب کا کیا تعلق ہے؟

''ہے۔ برخوردار ہے۔ کیونکہ جب میں ۱۹۰۴ء میں حضرت داغ کا شاگرد ہوا تھا' اس وقت میری عمر ۱۸ سال تھی اور میں اس وقت ''آفتاب داغ'' کا حافظ بن چکا تھا۔ تب سے اب تک اسی کو دہرا رہا ہوں۔ داغ کا کلام آسانی سے ہر ایک کو منہ نہیں لگاتا۔ اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان کی تہذیب سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور مجھے لگتا ہے ان تینوں ضرورتوں سے آپ محروم ہیں''۔

ناطق صاحب کے طنز پر سوال کرنے والا جھلا کر کہنے لگا۔ یہ محض آپ کی عقیدت ہے۔

مجھے تو آپ کے استاد میں کوری بازاریت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

''اگر نظر نہیں آتا تو سنیئے آپ جس سے مخاطب ہیں اس کے شجرہ میں بغداد کا ریگستان ہے' خون میں افغانستان ہے تہذیب میں ہندوستان ہے اور وہ داغ کے اکھاڑے کا ادنی پہلوان ہے۔ میں نے دیوبند میں طب کی تعلیم حاصل کی ہے۔ جو جوانی میں بینائی کھو دیتے۔ ان کا علاج کرنا مجھے آتا ہے، سمجھے صاحبزادے......

ناطق کے طنزیہ انداز سے ساری محفل قہقہ زار بن گئی اور وہ صاحب چہرہ لٹکا کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر بعد رخصت ہو گئے۔

مولانا ناطق کی شاعری کی ابتدا ۱۹۰۰ء میں دارالعلوم دیوبند سے ہوئی جہاں وہ طالب علم تھے۔ اس زمانے میں دیوبند میں انسان کے لئے حیوان ناطق کی اصطلاح رائج تھی۔ اس اصطلاح میں ناطق کا لفظ انہیں پسند آیا اور اسے انہوں نے تخلص کے طور پر اختیار کر لیا۔ ابتدا میں اطہر ہاپوڑی اور منیر شکوہ آبادی کو بھی کلام دکھایا لیکن جب مرزا داغ کے کلام سے متعارف ہوئے تو خط و کتابت کے ذریعہ انہیں کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ داغ کے دیگر شاگردوں کی طرح ناطق بھی پیروی کلام استاد کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ان کی غزلیں' بیان کی صفائی' محاوروں کی رعنائی اور سادگی و زیبائی کے لحاظ سے داغ اسکول کی نمائندگی کرتی ہیں۔ لیکن ان میں ان کے اپنے مشاہدے اور لسانی تجربے کے رنگ بھی نمایاں ہیں۔ اور یہی جسارتیں اور ندرتیں انہیں دوسروں سے مختلف کرتی ہیں۔ غزل کی روایتی زبان میں' لفظوں کے نئے برتاؤ ان کے تخلیقی مزاج کا سراغ ہیں۔

رونا بھی بیٹھ کر' کبھی ہوتا نہیں نصیب
گویا ہمارے ساتھ محرم سفر میں ہے

اپنی رسوائی کا غم تھا جب ہمیں' وہ دن گئے
اب تو یہ غم ہے کہ ایسی پھر نہ رسوائی ہوئی

جو چیز انہوں نے خط میں لکھی تھی نہیں ملی

خط ہم کو مل گیا ہے تسلی نہیں ملی
خیال آتا ہے اٹھنے بیٹھنے کا چلنے پھرنے کا
تمہاری یاد تصویروں کا البم ہوتی جاتی ہے۔

ناطقؔ صاحب صنف غزل کے ساتھ نظمیں بھی کہتے تھے۔ان کی نظموں کا مجموعہ نطق ناطق کے نام سے ۱۹۱۳میں شائع ہوا تھا۔شاعری کے علاوہ ان کی کئی نثری کتابیں بھی ہیں۔ان میں سبع سیادہ (مضامین کا مجموعہ) کنز المطاب (شرح دیوان غالبؔ) اور کئی سیاسی و سماجی موضوعات پر تحریروں کے مجموعے شامل ہیں۔ان کے شاگردوں میں عبدالباری آسی الدنی کا نام بھی ہے۔زندگی کے ۸۳سال پورے کر کے ۲۷مئی ۱۹۶۱سے ان کی یادیں شہر ناگپور کے ایک مسلم قبرستان مومن پورہ میں ادیبوں اور شاعروں کے لئے نشان ہدایت ہیں

ملک سخن ہر اہل سخن کو ہوا نصیب
ناطقؔ مرے نصیب میں یہ ناگپور تھا۔

نواب حکیم احمد

نواب حکیم احمد

نام حکیم احمد سلسلہ نقوی' سندھیا حکومت نے نواب کے خطاب سے نوازا' خواص' بزم اردو کی ماہانہ نشستوں میں ان کا دیدار کرتے تھے' عوام صرف جمعرات کو انہیں دیکھتے تھے۔ وہ اپنے مرتبہ اور اقتدار کی وجہ سے پاس ہو کر بھی دور رہنے پر مجبور تھے۔

جمعرات کا دن مادھوراؤ سندھیا (مرحوم کانگریس لیڈر سندھیا کے دادا) کے دور حکومت میں گوالیار شہر میں بہت اہم ہوتا تھا۔ اس دن راجہ کی سواری نکلتی تھی۔ شہر کے خاص بازار باڑے کے پچھواڑے منصور شاہ بابا کی درگاہ پر سرکاری چادر چڑھانے اور مزار کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سر جھکانے۔ سواری نکلنے سے پہلے وردی پوش سقے مخصوص راستوں پر بڑی بڑی مشکیں کندھوں پر لٹکائے چھڑکاؤ کرتے تھے۔ راجہ سونے چاندی سے لدے پدے ہاتھی پر نکلتے تھے۔ جھرونکوں سے پھول برسائے جاتے تھے راستوں اور عمارتوں کے چھجوں پر دیکھنے والوں کے جھنڈ نظر آتے تھے۔ مزار کی زیارت کے بعد وہ تھوڑی دور پر کرشن مندر میں گھنٹیاں بجاتے تھے' پجاری سے ماتھے پر تلک لگواتے تھے اور پھر واپس محل میں لوٹ جاتے تھے منصور شاہ کے مزار سے راجہ کی عقیدت کی لمبی تاریخ تھی یہ انیسوی صدی کی پانچویں دہائی سے شروع ہوتی ہے۔

۱۸۴۳ء میں والی ریاست جنکو جی نے لاولد انتقال کیا تھا۔ ان کے بعد ان کی بیوہ رانی نے سندھیا خاندان سے ایک لڑکے کو گود لے کر جیا جی راؤ سندھیا کے نام سے تخت نشین کیا۔

لیکن ۱۸۵۸ء میں تانتیا ٹوپے اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی کے حملوں نے اسے شہر بدر کر دیا۔ انگریزی فوج کے سربراہ مسٹر ہیو روز نے انہیں دوبارہ حکمراں بنایا۔ کہتے ہیں تخت کی دوبارہ بحالی میں منصور شاہ بابا کی دعا شامل تھی۔ اس روحانی فیض کے عوض راجہ نے اس درگاہ کے سجادہ نشین کو سری صاحب کے لقب سے اپنے دربار کا نگہدار بنایا اور ہر جمعرات مزار کی زیارت کو سرکاری روایت ٹھہرایا۔ یہ روایت مادھوراؤ کی حیات تک نبھائی گئی۔ ان کے بعد ان کے گدی نشین راجہ نے ہندو مہا سبھا کے اثرات میں اس موروثی پرمپرا کو بھی ہندو مسلم کا تنازعہ بنا دیا۔ اسی راجہ کے دور میں ناتھورام گوڈسے کو گاندھی مرڈر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

مادھوراؤ سندھیا کے محل میں رخصت ہوتے ہی سارا مجمع نئی سڑک کی طرف مڑ جاتا تھا جہاں سے سہ پہر کے وقت دو سفید گھوڑوں کی سجی بنی بگھی گذرتی تھی۔ اس کے دائیں بائیں کے پائدانوں پر دو سرکاری اہل کار ریاستی وردیوں میں ملبوس ہاتھوں میں چاندی کی موٹھ والے بلم لئے کھڑے ہوتے تھے۔ اس میں سندھیا کابینہ کے امور خارجہ کے وزیر خواجہ خانون کی درگاہ میں حاضری دینے جاتے تھے۔ ان کا نام حکیم احمد نقوی تھا۔ جو وزیر ہونے کے علاوہ مشہور شاعر اور ادیب تھے۔ حکیم احمد بدایوں کے تھے۔ ان کے مورث اعلی ایک صوفی شرف الدین محمد اعلی ایک عرب تھے جن کا سلسلہ چودہ واسطوں سے حضرت علی تک پہونچتا تھا۔

شرف الدین قطب الدین ایبک کے عہد میں ہندستان آئے اور بدایوں کو اپنا مرکز بنایا اور یہیں لحد نشیں ہو کر نشان ہدایت بن گئے۔ اس خاندان کے بعض افراد بہ سلسلہ معاش ۱۸۵۰ء میں گوالیار آئے بدایوں سے گوالیار آنے والے اس کارواں میں سید کریم احمد بھی تھے جن کے گھر میں ۱۸۷۹ء میں حکیم احمد پیدا ہوئے اور یہیں کے وکٹوریہ کالج (جو اب مہارانی لکشمی بائی کالج ہے) سے سن ۱۹۰۰ میں گریجوئٹ ہو کر راج دربار سے منسلک ہو گئے اور اپنی ذہانت کے سہارے تھوڑے ہی عرصہ میں وزارت خارجہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی ایک غزل کے شعر ہیں۔

دل اگر زندہ نہ ہو جینا نہ جینا ایک ہے
مے اگر بے کیف ہو پینا نہ پینا ایک ہے

ہے، خدائی بھر کے طوفانوں کی دونوں میں جگہ
نوح کی کشتی ہو یا دل کا سفینہ ایک ہے

نئی نئی زمینوں کی تلاش اور خوش آہنگ الفاظ کا انتخاب ان کی غزلوں کی حسن کاریاں تھیں۔ مشاعروں سے کتراتے تھے نشستوں میں نہایت طمطراق سے سناتے تھے بھرائی آواز اقتدار کا رعب مطلع سے مقطع تک داد و تحسین سے محفل پر شور رہتی تھی۔ سناتے وقت اعتماد کا یہ عالم تھا کہ ادھر ادھر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ مشہور نقاد ادیب اور ماہنامہ نگار کے مدیر نیاز فتحپوری نے ان کے بارے میں لکھا تھا۔

''یوں تو فطرت کی طرف سے آپ کو ادبی ذوق بھی بڑا پاکیزہ عطا ہوا ہے۔ آپ بڑے اچھے سخن فہم بھی ہیں اور سخن گو بھی لیکن آپ کے حقیقی ذوق کا تعلق ہمیشہ علمی و تاریخی رہا ہے ...... اگر معاشی مصروفیت حائل نہ ہوتیں اور فطری ذوق کی تکمیل کا موقع ملتا تو اس وقت تک ایک بڑے محقق مصنف کی حیثیت سے ملک میں روشناس ہو چکے ہوتے''

لیکن اپنی سرکاری و سماجی مصروفیات کے باوجود حکیم احمد کا رشتہ علم و ادب سے کبھی ٹوٹا نہیں وہ بزم ادب کے صدارتی فرائض بھی نبھاتے رہے شعر بھی پابندی سے کہتے رہے اور سناتے رہے ادب و فلسفہ پر مضامین بھی لکھتے رہے اور چھپواتے رہے۔ ان کا تعلق ادب و علم سے سنتوں اور صوفیوں جیسا تھا۔ نام و نمود سے بے نیاز۔ وہ گیتا کے مطابق کرم کے یوگی تھے اس کے اوبھ کے بھوگی نہیں تھے۔ ان کے مضامین ماہنامہ نگار میں شائع ہوتے تھے۔ لیکن ح۔ا کے حرفوں کے ساتھ۔ نیاز فتحپوری نے کبھی ان منہ بند حرفوں کو کھولا نہ حکیم احمد نے ان کے بارے میں کسی سے بولا۔ ہندوستان کے کلاسکی فلسفہ میں تصور وقت، تسلسل سے عبارت ہے۔ اس میں فرد کی جگہ اجتماع کی اہمیت ہے۔ حکیم احمد بھی کام کے ساتھ نام جوڑنے کے قائل نہیں تھے۔

عجب چلتا ہوا جادو ہے اس دنیائے فانی کا
کہ خواہش مند ہے ہر ایک عمر جاودانی کا

یہی وہ رویہ تھا جس کی وجہ سے ان کی حیات میں ان کا کوئی مجموعہ چھپا نہ مضامین کی کتاب شائع ہوئی۔ وہ اپنے نام سے زیادہ اپنے کام سے جانے جاتے ہیں۔ حکیم احمد شروع سے ہی اونچا سننے کے مرض کے شکار تھے عمر کے ساتھ اس میں اور زیادتی ہوگئی تھی۔ آدمی سمجھدار تھے۔ اس فطری کمی کو انہوں نے ظاہر کئے بنا بولنے والوں کے ہونٹوں کے کھلنے ملنے اور سمٹنے سکڑنے کے گہرے مشاہدہ سے پورا کرلیا تھا۔ وہ حرفوں کی ادائیگی میں بولنے والے کے لبوں کی حرکتوں سے بات تک پہونچ جاتے تھے انہوں نے اس سلسلے میں کئی نئی پرانی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ لیکن ان کا یہ علم بھی ان کی دیگر ادبی مصروفیات کی طرح راز ہی تھا۔ اس راز سے پردہ اس وقت ہٹا جب انہوں نے ایک نشست میں صدارتی غزل پڑھنے کے بجائے ایک مختصر سی تقریر کی تھی۔

''میں آج حاضرین کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوش ہوں کہ آپ کی وقتاً فوقتاً تنقید کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کو پرکھا اور شاعری ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اب تک جو کہا ہے اسے رد کرتا ہوں آپ نے اچھا کیا جو مجھے بہرہ سمجھا اور میری موجودگی کو در گذر کر کے میری شاعری کے بارے میں اپنی صحیح رائے کا اظہار کرتے رہے۔ آپ جو گاہے بگاہے بولتے رہے ہیں وہ میں اپنی آنکھوں سے سنتا رہا ہوں اور اس پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں آپ کی نصیحت کے لئے شکر گذار ہوں۔''

بزم کے اراکین نے انہیں سمجھانے اور منانے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے جو فیصلہ کرلیا تھا۔ اسے نہیں بدلا۔ یہ اس معاشرہ کی بات ہے جب منہ سے نکلی بات پتھر کی لکیر کی طرح ہوتی تھی اور اس میں کوئی تبدیلی کرداری تقصیر کی طرح ہوتی تھی۔ اس صدارتی تقریر کے بعد نہ کسی نے ان کے منہ سے ان کا کلام سنا نہ انہوں نے شعر کہا۔ ان کا جو آخری شعر سنا تھا وہ یوں تھا

شعر کہتا ہوں ! یا خدا جانے : شعر کے فن کو خوار کرتا ہوں

حکیم احمد مزاجاً تنہائی پسند تھے ان کے عہدہ نے بھی ان پر بہت سی احتیاطیں عائد کردی تھیں۔ محفلوں میں وہ بے تکلف ہوتے تھے نہ کلام سناتے وقت کسی کو مخاطب کرتے تھے۔ اپنا کلام

سنانے تک وہ سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی کہیں اور ہوتے تھے۔ ان کی اس بے نیازی اور احتیاط مزاجی سے صرف ادیب و شاعر ہی نہیں خود ان کے گھر والے بھی خائف رہتے تھے۔ جن کو بھی ان سے کچھ کہنا ہوتا تھا یا کوئی کام کروانا ہوتا تھا وہ ان کے بجائے ان کی بیگم سے رجوع کرتے تھے ان کی بات وہ کبھی نہیں ٹالتے تھے۔ وہ حکومت میں ہوم ڈپارٹمنٹ کے وزیر تھے اور بیگم گھر میں سرکار دربار تھیں۔ حکیم احمد صرف انہیں کی سنتے تھے انہیں سے ڈرتے تھے اپنی بیگم کے انتقال پر انہوں نے فارسی میں ایک رقت آمیز مطلع کہا تھا

زر قتن تو من از عمر بے نصیب شدم
سفر تو کردہ من در وطن غریب شدم

بیگم کی جدائی میں وہ کچھ دن خواجہ خانون کی درگاہ سے بھی ناراض رہے۔ یہ ناراضگی کئی ہفتے چلی پھر جب ایک رات خواب میں خود خواجہ تشریف لائے اور انہوں نے قرآن کے الفاظ سنائے۔ ''کل نفس ذائقۃ الموت۔ تو وہ پھر سے دوگھوڑوں کی بگھی میں نظر آئے۔ اور یہ زیارت کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا۔

حکیم احمد وضعدار اور دین دار انسان تھے۔ ان کے مکان کے بڑے پھاٹک پر ہر وقت فقیروں کی لمبی چوڑی بھیڑ رہتی تھی جن کی وہ خاموشی سے مدد کرتے رہتے تھے۔ مذہب سے ان کا رشتہ مولویانہ نہیں تھا اس میں صوفیانہ کشادگی تھی۔ اس میں اپنے عقیدہ کی عزت کے ساتھ دوسروں کی روایت کی وقعت بھی شامل تھی۔ اس فکری کشادگی نے ان سے ویدی لٹریچر جیسی اہم کتاب بھی لکھوائی۔ یہ کتاب ان کے گہرے مطالعہ اور کئی سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھی۔ اس میں انہوں نے ہندوؤں کے مقدس صحائف رگ وید سام وید یجر وید اور چوتھے اور آخری وید اتھر وید کے منتخب بھجنوں کا سلیس اور صاف زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ساتھ میں عہد بہ عہد بدلتے معاشرہ کی قدروں پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ ان تبصروں میں مغربی و مشرقی دانشوروں کی رایوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے حکیم احمد کے ترجمہ کی زبان سیدھی صاف اور عوامی زبان کے قریب ہے۔ پہلے وید

رگ وید کی ایک رچا کا ترجمہ ملاحظہ کریں اس میں رہنے بسنے اور دان پن کی ترغیب ہے

جو دے سکتا ہے

اس کو چاہیے ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرے

دولت رتھ کے دو پہیوں کی طرح گھومتی ہے

کبھی ایک کے قریب ہوتی ہے۔

کبھی دوسرے کو چومتی ہے

جو شخص پیروں کو حرکت میں رکھتا ہے

وہی سفر پورا کرتا ہے

جو پوجا کرنے والا بولتا رہتا ہے

وہ اس سے زیادہ کماتا ہے

جو خاموش رہتا ہے

ویدی لٹریچر اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے اس میں وہ سارے مضامین شامل ہیں جو ماہنامہ نگار میں بنا نام کے شائع ہوئے تھے۔ نیاز فتحپوری نے ہی انہیں یکجا کر کے شائع کیا تھا۔ اس کے دیباچے میں انہوں نے لکھا تھا۔

یہ نہ صرف ویدی ادب ہے بلکہ اس سے پیدا ہونے والے دوسرے مذہبی و تاریخی لٹریچروں کے لحاظ سے اتنی مکمل چیز ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اس خاص موضوع پر اس قدر احتیاط اور تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔

حکیم احمد نقوی کی یہ پہلی اور آخری کتاب تھی جو ان کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب پر سن اشاعت ۱۹۶۰ء ہے نیاز کے اصرار پر وہ اس کی اشاعت پر راضی تو ہو گئے لیکن اس

روایت شکنی سے ناراض ہو کر وہ کچھ دن بعد ہی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ خواجہ خانون نے بشارت میں ان کی اہلیہ کی موت کا قرآنی جواز دیا تھا نیاز ان کی کتاب کی اشاعت کا کوئی قابل یقین جواز فراہم نہیں کر سکے اس لیے ان کی ناراضگی پھر سے بحال نہیں ہوئی۔

سُہامجددی

مولانا سہا مجددی

سید ممتاز حسین ۹ فروری ۱۸۹۲ء میں پرانے بھوپال کی نوابی ریاست میں پیدا ہوئے۔ زندگی کے پچپن سالوں میں گھر کے اس نام میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ ان اضافوں میں کچھ ان کا ہاتھ تھا کچھ ان کے مداحوں کا۔ پہلے انہوں نے اس میں سہا لگا دیا۔ بعد میں ان کے پرستاروں نے اسے مولانا' سے سجا دیا۔ پھر حضرت شاہ سے بیعت کی رعایت سے خود انہوں نے اس میں مجددی کا اضافہ فرما دیا۔ جب وہ سید ممتاز حسین مولانا سہا علیگ مجددی ہو گئے تو ان کو دیکھنے اور پڑھنے والوں نے کچھ عرصہ تو اس ضرورت سے زیادہ لمبے نام کو دوہرایا پھر ان کی جسمانی ساخت کے مطابق اسے بھی مختصر کر کے صرف سہا مجددی بنا دیا۔ اسی نام سے وہ ادبی دنیا میں مشہور ہوئے۔

میں نے بچپن میں پہلی بار انہیں بھوپال میں ہی اپنے والد دعا ڈبائیوی کے ساتھ دیکھا تھا۔ میرے والد قد سے چھ فٹ سے کچھ اوپر تھے اور سہا صاحب ان کے گھٹنے کے برابر تھے۔ وہ پیچھے سے میرے جیسے کم سن اور سامنے سے میرے والد کے ہم سن لگتے تھے۔ تین سوا تین فٹ کی لمبائی پر' گردن تک بٹن بند چھوٹی سی شیروانی' اسی حساب کا چوڑی دار پاجامہ بچے جیسے ہاتھ میں اپنے قد سے آدھی چاندی کے موٹھ کی چھوٹی سی چھڑی' سر پر گول فر کی ٹوپی اور منہ میں پان والا یہ شخص جوش ملیح آبادی کی سوانح یادوں کی بارات کا ایک اہم کردار ہے۔ جوش نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

''ابھی کل کی بات ہے' کہ ۱۹۴۰ء میں میرے محبوب دوست سہا زندہ تھے۔ ہم دونوں کا

فردوسِ رنگ و بو یعنی شہر لکھنؤ میں قیام تھا۔ میرا مکان تھا بنارسی باغ کے پھاٹک کے سامنے اور وہ رہتے تھے لال باغ کے چوراہے کے نکڑ پر۔ ہمارے مکانوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا۔ ہم ایک دوسرے سے تقریباً روز ملتے جلتے اور آپس میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ہمارے پڑوس میں یاد ش بخیر ایک مشہور و قبول صورت مغنیہ کا مکان تھا جہاں اکثر ہم لوگ یکجا ہو کر اس وقت تک ساغر و مینا کے پھول چننے، گانا سننے اور نغمہ و حسن پر سر دھننے کے شغل کو جاری رکھتے تھے۔ جب تک کہ رات کی زلفیں کمر سے گذر کے پنڈلیوں تک نہیں آجاتی تھیں"

ملکی تقسیم کے بعد وہ مسلمان جو پاکستان نہیں جا سکے تھے۔ یا نہیں جانا چاہتے تھے وہ حیدر آباد، رام پور، بھوپال، جاورہ، فیروز پور وغیرہ مسلم ریاستوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ ان دنوں اپنے اپنے گھروں سے ہجرت کرنے والوں میں میرا خاندان بھی تھا۔ ہم سندھیا اسٹیٹ سے اکھڑ کے نواب حمید اللہ کے بھوپال میں بسے تھے۔ بھوپال میں جس علاقہ میں ہمارا قیام تھا اس کے سامنے ہی سہا صاحب کا مکان تھا۔ اس میں وہ اپنی دوسری نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ تھے۔ سہا صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی کے وقت ساتھ میں جوانی تھی دوسری بار عمر کی بے سرو سامانی تھی۔ لیکن نہ جوانی نے ان کا ساتھ نبھایا نہ بے سرو سامانی نے ترس کھایا۔ دونوں دفعہ انہیں وہ سکون نہیں ملا جس کی انہیں تلاش تھی۔ ملتا بھی کیسے وہ قلم کے دھنی تھے لیکن جسم سے منحنی تھے۔

کرناٹک کی زبان کے مشہور ڈرامہ نگار گریش کرناڈ نے اپنے ایک ڈرامہ "ہے ودن" میں عورت کی نفسیات کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ عورت کی زندگی میں دو مرد ہیں۔ ان میں ایک اس کا شوہر ہے جو قلم کار ہے۔ عورت کو اس سے پیار ہے۔ دوسرا اس کے شوہر کا دوست ہے جو پہلوان ہے۔ جب دونوں عورت کے لئے پانی کی تلاش میں الگ الگ سمتوں میں نکلتے ہیں اور پھر کالی کے ایک مندر میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ وہاں دونوں میں لڑائی ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے کی گردن جسموں سے الگ کر دیتے ہیں جب عورت انہیں تلاش کرتی وہاں آتی ہے تو دونوں کو مرا ہوا دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ دیوی ماں کالی اس کی گھبراہٹ پر ترس کھاتی ہے اور حکم سناتی

ہے۔ کٹی ہوئی گردن کو جس جسم سے لگاؤ گی اسے پھر سے زندہ پاؤ گی۔ عورت دونوں کو دیکھتی ہے اور قلم کار کے سر کو پہلوان کے جسم سے جوڑ دیتی ہے۔'' پہلوان اور قلم کار کا یہ ملاپ عورت اور مرد کے رشتہ کا استعارہ بھی ہے۔

پہلی بیوی کی طرح ان کی دوسری اہلیہ بھی کچھ دن کے بعد ویسی نہیں رہیں جیسی وہ شادی سے پہلے نظر آتی تھیں۔ یہ دوسرا تجربہ بھی سہا کی زندگی میں کسی خوشگوار تبدیلی کا کارن بننے کے بجائے ان کے لئے نئی الجھنوں کا ہی باعث بنا۔ قدرت کی ناانصافی کو وہ اپنی کوششوں سے بدلنا چاہتے تھے لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا......

سہاؔ نرالی ہے اپنی ہستی سہاؔ خیالی ہے اپنی دنیا
لگائے یادِ خرام ٹھوکر سنائے تصویر یار باتیں

سہاؔ صاحب کی یہ تصویر یار جو انکی پچاس سے اوپر کی عمر کی پریشانی تھی' بھوپال میں میری اردو کی استانی تھی۔ وہ دن سہاؔ صاحب کی بے روزگاری کے بھی تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ قدرت کی کارفرمائی اور سماجی بے اعتنائی کو بہلانے کے لئے وہ شراب کا سہارا لیتے تھے۔ جب وہ اس عالم میں گھر میں آتے تھے تو جو بھی سامنے آتا تھا اسے چھوٹے سے منہ سے بڑی بڑی گالیاں سناتے تھے۔ اس شور غل سے اکتا کر ان کی بیوی انہیں اٹھا کر مچان پر بٹھا دیتی تھیں۔ اس عمل پر پہلے وہ جھلاتے تھے پھر تھک کر وہیں سو جاتے تھے۔ سہاؔ صاحب کا مشہور شعر ہے۔

کھویا سہاؔ کو بھی تری بیداد ناز نے
کن خوبیوں کا شخص کہ پیدا نہ ہو کہیں

غالبؔ کی طرح سہاؔ صاحب کو بھی اپنی خوبیوں کا علم تھا۔ ان خوبیوں کی آبیاری میں خداداد ذہانت کے ساتھ خود ان کی کوشش کا بھی بڑا دخل تھا۔ وہ ایک متمول گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد سید یحییٰ حسین شاہ جہاں بیگم والیہ بھوپال کے عہد میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سہا کی ابتدائی تعلیم

بھوپال میں ہوئی پھر علی گڑھ کالج سے انٹرمیڈیٹ کی ڈگری حاصل کی کالج کے دنوں میں سہا صاحب کی مقرری کی بڑی دھوم تھی۔ وہ ہر موضوع پر نہایت مدلل اور عالمانہ انداز میں بولنے کے ماہر تھے۔ ان دنوں وہ فن تقریر کے مقابلوں میں رنگون اور دوسرے شہروں میں کالج کی نمائندگی کر چکے تھے۔ عربی فارسی اور انگریزی کے گہرے مطالعہ نے ان کی نثر اور شاعری کی تہذیب کی تھی وہ پندرہ سولہ سال کی عمر سے شعر کہہ رہے تھے۔ اور تیس سال کی عمر تک وہ اپنی مشاقی اور انفرادیت کے لحاظ سے ہندوستان کے مشاہیر میں شمار ہونے لگے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حالی کی صدائے احتجاج پر ادب کا ایک قافلہ ان کا ہم سفر ہو چکا تھا۔ امیر و داغ کی حکمرانی میں اقبال کی جادو بیانی شعر و ادب کے نئے امکانات کی پاسبانی کر رہی تھی۔ اور اس کے کچھ بعد حسرت یگانہ فانی اصغر جگر فراق غزل کو فکر و اظہار کے نئے افقوں سے متعارف کر رہے تھے۔ انہیں کے ساتھ داغ اسکول کی نمائندگی کرنے والے استاد بھی سرگرم عمل تھے۔ لیکن حالات کی تبدیلی نے سامعین و قارئین کے مزاج کو کچھ اس طرح بدل دیا تھا۔ کہ ان کو زبان و بیان کے حسن کی داد تو دی جاتی تھی۔ مگر یہ شاعری لکیر کے فقیر کی روایت کی اسیر ہی سمجھی جاتی تھی۔ جو وراثت کا تو حصہ تھی لیکن عہد گذشتہ کا قصہ تھی۔

سہا بھی انہیں شعراء کے کارواں میں شامل تھے جو شعر و ادب کی نئی راہوں میں رواں تھا۔ سہا جب ایوان غزل میں نمودار ہوئے تو ان کی سج دھج دوسرے ہم عصروں سے مختلف تھی۔ ان کے دائیں طرف مرزا غالب تھے اور بائیں طرف گلزار داغ اور آفتاب داغ والے نواب مرزا داغ تھے۔ غالب اور داغ کے امتزاج نے ان کی غزل کی تعمیر کی تھی۔ جو شروع میں داغ کی خوش گفتاری اور بعد میں غالب کی بردباری کی فنکاری بنی۔ ان دونوں رنگوں کے شعر ان کے یہاں یوں ہیں۔

شرابیوں کی سی لغزشیں ہیں، نسیم کی سی روانیاں ہیں
بڑے قیامت کے ہیں یہ فتنے جوان کے قدموں میں پل رہے ہیں

کسی نے بھی نہ افسون نگاہ فتنہ گر جانا
انہیں کس نے سکھایا اس طرح دل میں اتر جانا

کچھ عشق جانتا ہے اس وضع زندگی کو
ہے ہم پہ نیند طاری خوابوں میں جا رہے ہیں

اب جی میں ہے کہ خود کو مٹا کر بھی دیکھ لیں
ہستی ہی ان کے جلوے کا پردہ نہ ہو کہیں

آئے ہیں ابھی ہو کے پشیمان جہاں سے
پھر دل کا تقاضہ ہے کہ اک بار وہیں اور

سہاؔ صاحب کا جیسے اپنی زندگی سے لاتعلقی کے ساتھ تعلق کا رشتہ تھا یہی رویہ ان کا اپنی شاعری کے ساتھ بھی تھا۔ وہ ادبی رسائل میں تو چھپتے رہے لیکن زندگی میں نہ کلام کو یکجا کیا نہ اشاعت کے لئے اسے ترتیب دیا۔ اس لاپرواہی کی ایک وجہ غالبؔ کے کلام سے ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی بھی تھی۔ اس دلچسپی نے ان سے شرح دیوان غالبؔ لکھوائی جو ۱۹۲۲ء میں مطالب الغالبؔ کے نام سے شائع ہوئی۔ مطالب الغالبؔ کی اشاعت کے وقت سہاؔ صاحب مشکل سے تیس سال کے تھے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ملک گیر شہرت نے ان کی ذہانت وعلمیت کا چرچا زیادہ کیا ان کے شعری محاسن پر دھیان کم دیا۔ لمعاتِ سہاؔ کے نام سے ان کا ایک مختصر سا مجموعہ ضرور شائع ہوا ان کے انتقال کے بعد سہاؔ کی شاعری کے بارے میں شاعر انقلاب جوشؔ ملیح آبادی رقم طراز ہیں۔

”سہاؔ صاحب کے سے ننھے منھے انسان کے اندر کس قدر بڑائیاں تھیں ان کی طبیعت میں شاعری کا کس قدر رچاؤ تھا اور اس کے سینے میں جرات وبیباکی کس قدر زبردست آتش فشاں دہک رہا تھا..... سہاؔ کیا تھے کیوں کر بتاؤں؟

مطالب الغالب کی اشاعت نے ان کے لئے معاشی امکانات کی کئی راہیں کھول دی تھیں۔۱۹۲۲ء میں ہی کلیم احمد شجاع کی دعوت پر وہ لاہور چلے گئے اور اپنے دور کے ایک اہم ادبی رسالے ہزار داستان کو ایڈٹ کرنے لگے۔ممتاز شاعر اختر سعید خاں نے لمعاتِ سہا کے دیباچہ میں اپنے والد حامد سعید خاں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ایک دفعہ لاہور میں سہا صاحب کے ساتھ علامہ اقبال کے دولت کدہ پر تھے۔دوران گفتگو علامہ نے فرمایا تھا جب بھی ماہنامہ ہزار داستان آتا ہے تو پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ کہیں سہا جلوہ گر ہیں یا نہیں۔"

سہا صاحب کا نام ان کی کم عمری میں ہی ادب واحترام سے لیا جانے لگا تھا۔لاہور سے انہیں نواب خیر پور نے اپنی ریاست میں یاد کیا اور اپنے پرسنل سکریٹری کا عہدہ پیش کیا۔سہا صاحب کی سفارش پر ہی حفیظ جالندھری کو وہاں شاعر دربار کی حیثیت سے تقرر کیا گیا تھا۔لیکن سہا اپنی آزاد مزاجی کی وجہ سے وہاں بھی زیادہ نہیں ٹک سکے اور پھر سے لاہور آ کر ماہنامہ نیرنگ خیال کی ادارت کرنے لگے۔

سہا صاحب نہایت خود پسند حسن شناس اور خوددار انسان تھے۔وہ اپنے طور پر جیئے وہ بھی دوسروں کی طرح زندگی کے سرد وگرم سے گذرے تھے۔سماجی ضرورتوں نے انہیں بھی ستایا لیکن انہوں نے اپنی طبیعت کے خلاف کہیں سر نہیں جھکایا وہ دیکھنے میں چھوٹے لیکن حوصلوں اور ارادوں سے بہت بڑے تھے۔ایک بار وہ بھوپال کے اسٹیشن کے فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں اپنی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک انگریز آیا اور جہاں وہ بیٹھے تھے وہیں میز پر ٹانگیں پھیلا کر دراز ہو گیا۔سہا صاحب نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنی خفگی کا اظہار یوں کیا کہ اس کے منہ کی طرف جوتے کر کے لیٹ گئے۔انہیں اس حالت میں دیکھ کر اس نے غصہ سے پوچھا۔

who are you, little man

سہا نے اسی طرح آدھے لیٹے آدھے بیٹھے اسے جواب دیا۔

I am a poet, writer, orator and critic big man ''

انگریز جو پہلے غصہ میں تھا سہا صاحب کے انگریزی جواب سن کر صرف مسکراتے ہوئے اتنا بولا '' All in one ! '' اور پھر ٹانگیں نیچی کر کے بیٹھ گیا۔

سہا کی زندگی میں لاہور خیر پور اور لکھنؤ کے قیام کی کافی اہمیت ہے۔ ان کا ذکر سہا کے خطوط اور جوش کی کتاب یادوں کی بارات میں بکھرا ہوا ہے لیکن ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا مسکن بھوپال ہی رہا جہاں انہوں نے مختلف ادبی موضوعات پر مضامین تحریر کئے زیادہ غزلیں کہیں مطالب الغالب قلم بند کی اور یہیں ۱۹۴۰ء میں بھوپال کے ایک قدیم گھرانے میں دوسرا عقد کیا اور پھر یہیں ۲۷ دسمبر ۱۹۴۷ء کو اپنی تمام ذہانت اور تجربات کو سمیٹ کر ایک چھوٹی سی قبر میں سو گئے۔ کچھ دن اس چھوٹی سی قبر پر نصب کتبہ ان کی یاد دلاتا رہا اور پھر وہ نشان بھی مٹ گیا۔ اب شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ اردو ادب کا وہ مشہور دماغ کس جگہ محو خواب ہے۔ سہا صاحب کا مشہور شعر ہے

اٹھیے تو کہاں جائیے جو کچھ ہے یہیں ہے
باہر ترے گھر کے تو نہ دنیا ہے نہ دیں ہے
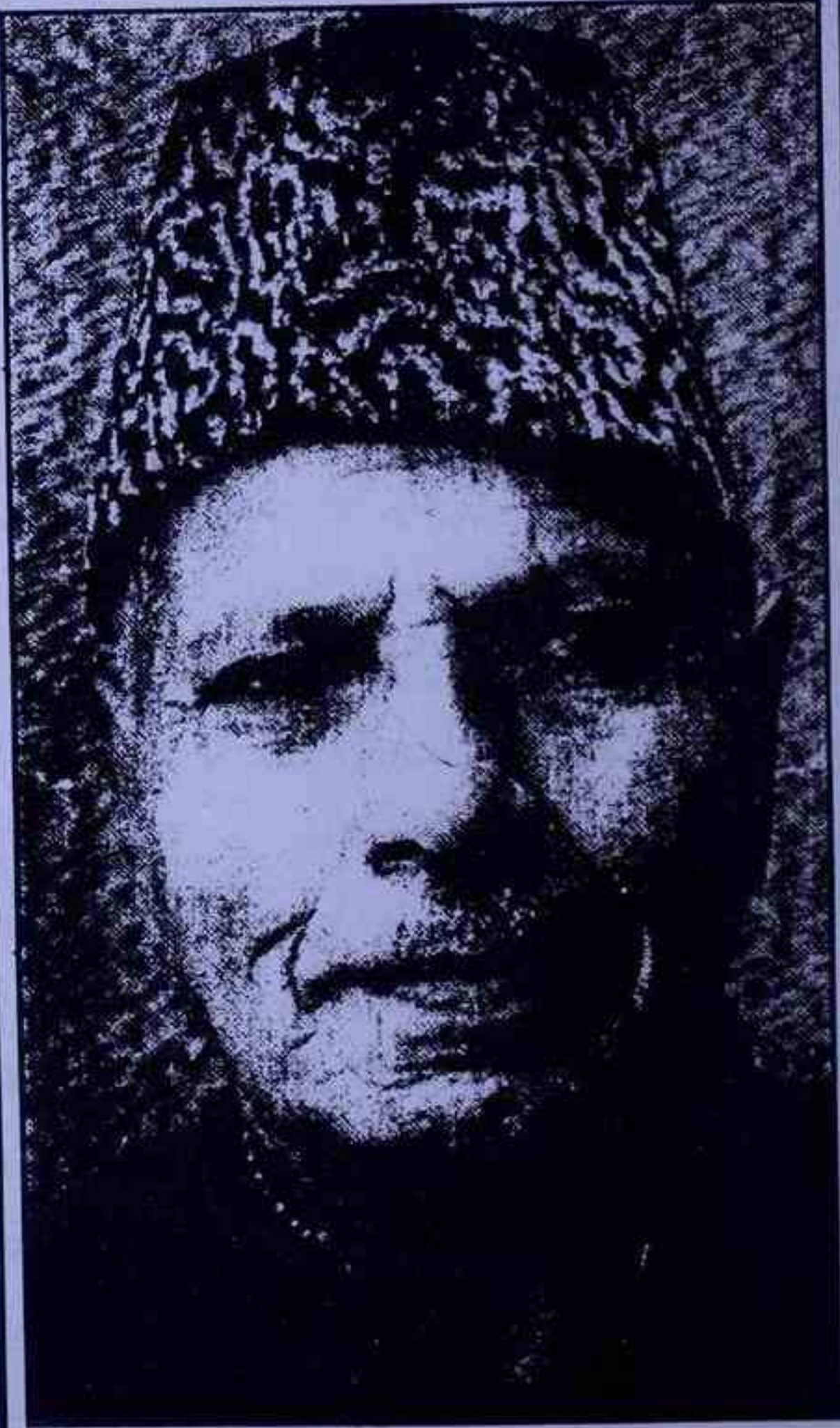
شعری بھوپالی

شعری بھوپالی

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے ایک فلم شوکت حسن رضوی کی ہدایت میں بنی تھی۔ نام تھا جگنو۔ اس میں دلیپ کمار کے ساتھ ہیروئن ملکہ ترنم نور جہاں تھیں۔ اس فلم میں ایک غزل نور جہاں کی خوبصورت آواز میں بہت مقبول ہوئی تھی۔ اس کا مطلع تھا۔

جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی
ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی

یہ غزل فلم میں آنے کے بعد ملک کے ہر گلی کوچے میں گنگنائی جانے لگی تھی۔ ہر محفل میں سازو آواز کے ساتھ سنائی جانے لگی تھی۔ محبت ناموں کی زینت بنائی جانے لگی تھی۔ اس غزل کی مقبولیت میں صرف ملکہ ترنم کی آواز اور طرز کا کمال ہی نہیں تھا لفظوں کا جمال بھی شامل تھا۔ آواز کو جب اچھے الفاظ مل جاتے ہیں تو نغمہ کو پر لگ جاتے ہیں۔ اس غزل کے شاعر ان دنوں کے نوجوان شاعر شعری بھوپالی تھے۔ شعری صاحب نے یہ غزل ممبئی کے ایک مشاعرہ میں سنائی تھی اور بے حد داد پائی تھی۔ آسان بے تکلف لفظ رواں مصرعے اور نوجوانی کی باادب سرمستی نے شوکت حسن رضوی کو بھی متاثر کیا اور انہوں نے اسے اپنی فلم کے لئے اچھے خاصے معاوضہ پر لے لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلموں میں ہرایرے غیرے سے گیت نہیں لکھوائے جاتے تھے اس کے لئے مستند شاعر بلوائے جاتے تھے۔ فلم میں اس غزل کی شہرت کو شعری نے کبھی کوئی اعزاز نہیں سمجھا۔ نہ بعد

میں اسے کہیں سنایا۔ جب مشاعروں میں اس کی فرمائش بڑھنے لگی تو انہوں نے اسی زمین میں دوسری غزل کہی اور وہی ہمیشہ سنائی۔ یہ دوسری غزل ان کے دوسرے مجموعے آتش دل میں شامل ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

چمن کے پھول اپنے چاند اپنا ' چاندنی اپنی
وہ اپنے ہو گئے تو ساری دنیا ہو گئی اپنی

شعری بھوپالی میر نظیر غالب اور تاج محل کے شہر اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ عالم غیب سے وہ عالم وجود میں کب موجود ہوئے اس کے بارے میں دوسروں کی طرح وہ خود بھی لاعلم تھے۔ انہوں نے اس تعلق سے ایک بار لکھا تھا۔

''تاریخ اور سن پیدائش کا صحیح علم نہ ہونا مجھ جیسے متوسط طبقے میں پیدا ہونے والے لوگوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے طبقے میں متمول خاندانوں کی طرح سال گرہ جیسی رسموں کا کوئی رواج نہیں۔ اور نہ ہمارے گھرانوں میں پیدا ہونے والے کسی بچے کے بزرگ اس کے مستقبل سے ایسی امید وابستہ کرتے ہیں کہ سن پیدائش کو یاد رکھا جائے۔''

گھر کا نام محمد اصغر خاں تھا۔ اس میں شعری کا اضافہ ملا رموزی کی دین تھی۔ جن سے انہوں نے ابتدا میں اردو سیکھی تھی۔ یہ وہی ملا رموزی تھے جو گلابی اردو اور نکاتی اردو کے موجد خیال کئے جاتے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے اپنی کتاب تاریخی ادب اردو میں ان کا ذکر پطرس' فرحت اللہ بیگ' رشید احمد صدیقی' اور عظیم بیگ چغتائی کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

''ملا رموزی کے یہاں عام طور پر سیاسی واقعات کی طرف اشارے ہوتے ہیں۔ اور مزاح سے فطری لگاؤ ہونے کی وجہ سے عبارت کافی دل چسپ ہو جاتی ہے۔ وہ سماج کے بے باک تنقید نگار تھے۔''

شعری کے والد محمد اکبر خاں اپنے عہد کے مشہور عالم دین اور فاضل ادب ہونے کے

علاوہ ایک عامل صوفی بھی تھے۔ اس صوفیانہ وراثت سے شعری صاحب نے تو اپنے کردار اور اشعار کو ہی سجایا لیکن ان کے بڑے صاحب زادے اختر شعری تیسری نسل میں اس وراثت کے عملی وارث بن گئے۔ کچھ سال پہلے تک ممبئی میں تھے۔ اور تعویز گنڈوں دعاؤں اور پیشین گوئیوں سے عقیدت مندوں کو فیض پہونچا رہے تھے۔ فلمی حلقوں میں بھی ضرورت مندان کے آگے پیچھے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اچانک غائب ہو گئے۔ ان کی گمشدگی کی بابت لوگوں کی اپنی اپنی تاویلیں ہیں۔ ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو اسے بھی ان کی کرامت سے تعبیر کرتا ہے۔ اختر شعری، شعری صاحب کی پہلی اہلیہ کی یادگار اور لاڈلے لڑکے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی تھے لیکن دونوں کا ساتھ رہنا مشکل تھا۔ باپ، جوان بیٹے کی صوفیانہ لاپرواہیوں سے پریشاں تھا۔ اور بیٹا بزرگ باپ کی شاعری سے نالاں تھا۔ اختر کے تئیں شاعری گم راہی کا راستہ ہے جو آدمی کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اسے اپنے والد سے محبت تھی۔ اس لیے وہ اکیلا جنت میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ شعری کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ جس کے لیے شعری صاحب تیار نہیں تھے وہ دنیا کی جنت کو عاقبت کی جنت پر قربان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہی اختلاف دونوں کے فاصلے کا باعث تھا۔ ایک گھر کی ذمہ داریوں سے مجبور تھا۔ دوسرا دنیا اور اس کی پرستاریوں سے دور تھا۔

شعری سولہ سال کی کچی عمر میں بوڑھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ان کے والد کی بے وقت رحلت نے گھر کا سارا بوجھ ان کے جوان کندھوں پر رکھ دیا تھا۔ اسی عمر میں انہیں تعلیم چھوڑ کر ملازمت کرنی پڑی۔ بھوپال کے ادبی ماحول نے ان میں جو شاعری کا شوق جگایا تھا وہ بھی جیسے تیسے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ اس شوق میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب وہ تعلیم طلب کے لیے بھوپال سے دہلی گئے۔ اس وقت دہلی میں اردو مجلس کی ادبی نشستوں کی کافی دھوم تھی۔ ممبئی کے استاد خلیل کی طرح جن کا ایک کمرہ کا گھر ایک زمانہ میں جاں نثار، باقر مہدی، ظ انصاری اور بہت سے دوسروں کا ٹھکانہ تھا۔ خواجہ شفیع کا دولت خانہ بھی دہلی کے کئی شاعروں کا آشیانہ تھا۔ ہر اتوار کو وہاں باقائدہ نشست ہوتی تھی۔ جس میں جوشؔ، بیخودؔ، استاد رسا، زار دہلوی، دتاتریہ کیفیؔ، اور

دوسرے نئے پرانے شعرا شریک ہوتے تھے۔ شعری کی شعری زبان کی چمک دمک میں اُنکی اپنی ریاضت اور اساتذہ کے کلام سے گہری قربت کے علاوہ ان نشستوں کی شرکت کا بھی بڑا رول ہے ۔یہیں سے ان کی آواز اور انداز کا اعجاز عوامی مقبولیت سے سرفراز ہوا۔ شعرؔی یوں تو باقاعدہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ لیکن غزل میں حسن کے احترام، محبت کی شائستگی، رشتوں کی پاکیزگی اور مجاز و حقیقت کی امتزاجی تابندگی کے لحاظ سے اگر وہ کسی کے قریب محسوس ہوتے ہیں تو وہ جگر مرادآبادیؔ ہیں۔ جگر صاحب بھی اپنے عہد میں جن نئے شاعروں پر زیادہ مہربان تھے ان میں مجروحؔ، خمارؔ، رازؔ اور شکیلؔ کے علاوہ شعری بھوپالیؔ کا بھی ایک نام تھا۔ شعرؔی کی غزل اپنے انداز میں اسی رنگ سخن کی آئینہ دار ہے جو جگر مرادآبادی کی شاعری کا معیار ہے۔

یہیں سے ہوتی ہے تمہید ہر فسانے کی
تری نظر ہے کہ تاریخ ہے زمانے کی

ابھی تو ایک ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے
بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

دل کو نگاہ مست سے بہلا کے پی گیا
اک جام ایک جام سے ٹکرا کے پی گیا

جب سے تری نگاہ نے پھیرا ہے دل سے رخ
فرق آ گیا ہے گردش لیل و نہار میں

شعری بھوپالیؔ مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے۔ وہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ اچھے پرفارمر بھی تھے۔ اس پرفورمینس میں وہ آنکھیں، ہاتھ اور جسم کی حرکتوں سے کام نہیں لیتے تھے۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے جادو جگاتے تھے۔ ان کا ترنم دوسروں سے مختلف ہی نہیں تھا اس

میں گائکی سے زیادہ لحن کا حسن تھا۔ مصرع کو آواز کے اتر چڑھاؤ سے توڑ کر اس طرح جوڑ تے تھے کہ پورا شعر تصویر بن کر سامعین کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتا تھا۔ شعری صاحب کو میں نے کبھی پورا شعر پڑھتے نہیں سنا۔ وہ عموماً قافیہ تک آ کر رک جاتے تھے' ردیف سامعین خود دہراتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرا مصرع آدھا ہی پڑھتے تھے بعد کا حصہ سامعین پورا کرتے تھے۔ وہ اکثر بیٹھ کر سناتے تھے۔ اور بیٹھے ہی بیٹھے مشاعرہ کو جب چاہتے تھے اٹھاتے تھے جب چاہتے تھے بٹھاتے تھے۔ میں نے پہلی بار انہیں دہلی کے مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ چھوٹا قد گٹھا ہوا جسم۔ چوڑی دار پاجامے پر کالی شیروانی۔ شیروانی کی اوپری بائیں جیب میں لال رنگ کا رومال سر پر اونچی باڑھ کی ٹوپی' جس کی وجہ سے ان کی جسمانی چھوٹائی میں تھوڑی سی لمبائی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ ناک نقشہ کھڑا تھا لیکن چہرہ جسم کے لحاظ سے مقابلتہً بڑا تھا۔ وہ آج ملیں یا کل' پانچ سال بعد ملیں یا دس سال بعد ہمیشہ ایک ہی جیسے نظر آتے تھے۔ ایسا لگتا تھا۔ وہ اپنی شیروانی ٹوپی اور پان بھرے منہ اور جیب میں لال رومال کے ساتھ ہمیشہ فریز میں رہتے تھے۔ جب بھی باہر نکلتے تھے سال مہینے بدلتے تھے خود نہیں بدلتے تھے۔ مشاعروں کے بہانے جب بھی جہاں جاتے تھے۔ بزرگوں کے مزارات کی زیارت ضرور فرماتے تھے۔ اور نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد میں جاتے تھے۔ شاعری کے علاوہ ہر شاعرانہ لت سے دور تھے ان کے ہوتے ادب میں کئی رجحانات آئے۔ کئی تحریکیں طلوع ہوئیں۔ غروب ہوئیں۔ لیکن غزل سے ان کے لگاؤ اور اس کے کلاسکی سجاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ان کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ پہلے کا نام صبح غزل تھا۔ دوسرا آتش دل کے نام سے شائع ہوا۔ پہلے مجموعے میں انہوں نے اپنے شعری نظریہ کے بارے میں لکھا تھا۔

''اصناف ادب میں میں غزل کو بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔ پچھلے کئی سالوں سے ہمارے شعراء نئے نئے تجربات کر رہے ہیں۔ اور اسی مدت میں بعض حضرات نے بالاتفاق غزل کی مخالفت بھی کی۔ لیکن غزل کی مقبولیت اور خسرویت کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ اور انہیں غزل کی تابندگی اور پائندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔''

شعری مطالعہ سے زیادہ مشاہدہ کے شاعر تھے۔ انہوں نے زندگی کو عقل کے بجائے اپنے حواس و جذبات سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ جگر صاحب بھی شاعری کے لئے مطالعہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اور انہوں نے بھی اپنے تجربات و مشاہدات سے اپنی غزل کی آرائش کی تھی۔ شعری کے شعری کردار وضعدار بردبار، سرشار اور رشتوں کی اقدار کے ترجمان تھے۔ ان کی محبت کے رنگ جو پہلے عمر کے لحاظ سے شوخ اور چنچل تھے۔ بعد میں تصوف کی آمیزش سے زیادہ گہرے اور تہہ دار ہو گئے تھے۔ آتش دل میں شامل کچھ شعر یوں ہیں......

اے اسیر تصورات بتا
کون اب کس کی بارگاہ میں ہے۔
بے حجابی نے گھٹادی میری قیمت میری قدر
تیرا جلوہ میں بھی تھا لیکن نظر آتا ہوا
وہ تو ملنے کو مجھ سے مل جائیں
عشق ہی راستہ نہیں دیتا

شعری کی شاعری کا حسن ان کی خود اعتمادی کا آئینہ ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت کے باوجود انہوں نے اسے کبھی بازار بنایا' نہ اسے اپنے معیار سے گرایا۔ وہ رسائل میں چھپنے چھپانے کے قائل نہیں تھے۔ بھوپال کے روزناموں میں کبھی کبھی نظر آجاتے تھے صرف نشستوں اور مشاعروں میں شعر سناتے تھے اور شعر آپ ہی آپ دور دراز کے علاقوں میں نکل جاتے تھے۔ دہلی کے جس مشاعرہ میں انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی نظامت کنور مہندر سنگھ سحر کر رہے تھے۔ نظامت میں محض لطیفے سنانے اور غیر ادبی جملے دہرانے کی روایت انہیں کی عطا ہے۔ مشاعروں میں کم عمر لڑکیوں کی شاعرات کی حیثیت سے شمولیت بھی انہیں کا احسان ہے۔ شعری کو بلاتے وقت انہوں نے یوں تعارف کرایا تھا۔ لیجئے اب شعری صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ وہ بھوپالی ہیں۔ ویسے بھوپال سے جو بھی آتا ہے اسے بھوپالی ہی کہتے ہیں۔ خدا جانے وہ اس تکرار سے کیا

کہنا چاہتے تھے۔ سحر صاحب کے اس جملہ پر ان کے مداحوں نے قہقہہ بلند کیا۔ لیکن شعری صاحب کو ان کا یہ غیر ادبی مذاق اچھا نہیں لگا۔ انہوں نے فوراً جواباً کہا۔ لیکن آپ جہاں سے آئے ہیں اسے ادب کی پامالی ہی کہتے ہیں۔ برجستہ جملے میں قافیہ کے استعمال پر شعری کے جواب کو سامعین نے اور زیادہ تالیوں سے سراہا اس بار پہلے سے زیادہ بلند قہقہہ لگا۔ قہقہہ کے بعد جب شعری صاحب نے غزل شروع کی تو سامعین اور شعریؔ کے درمیان صرف دادو ستائش تھی۔

جو کچھ دل پر گذرتی ہے وہی کہتا ہوں اے شعری
زمانے سے جدا ہے شعر اپنا شاعری اپنی
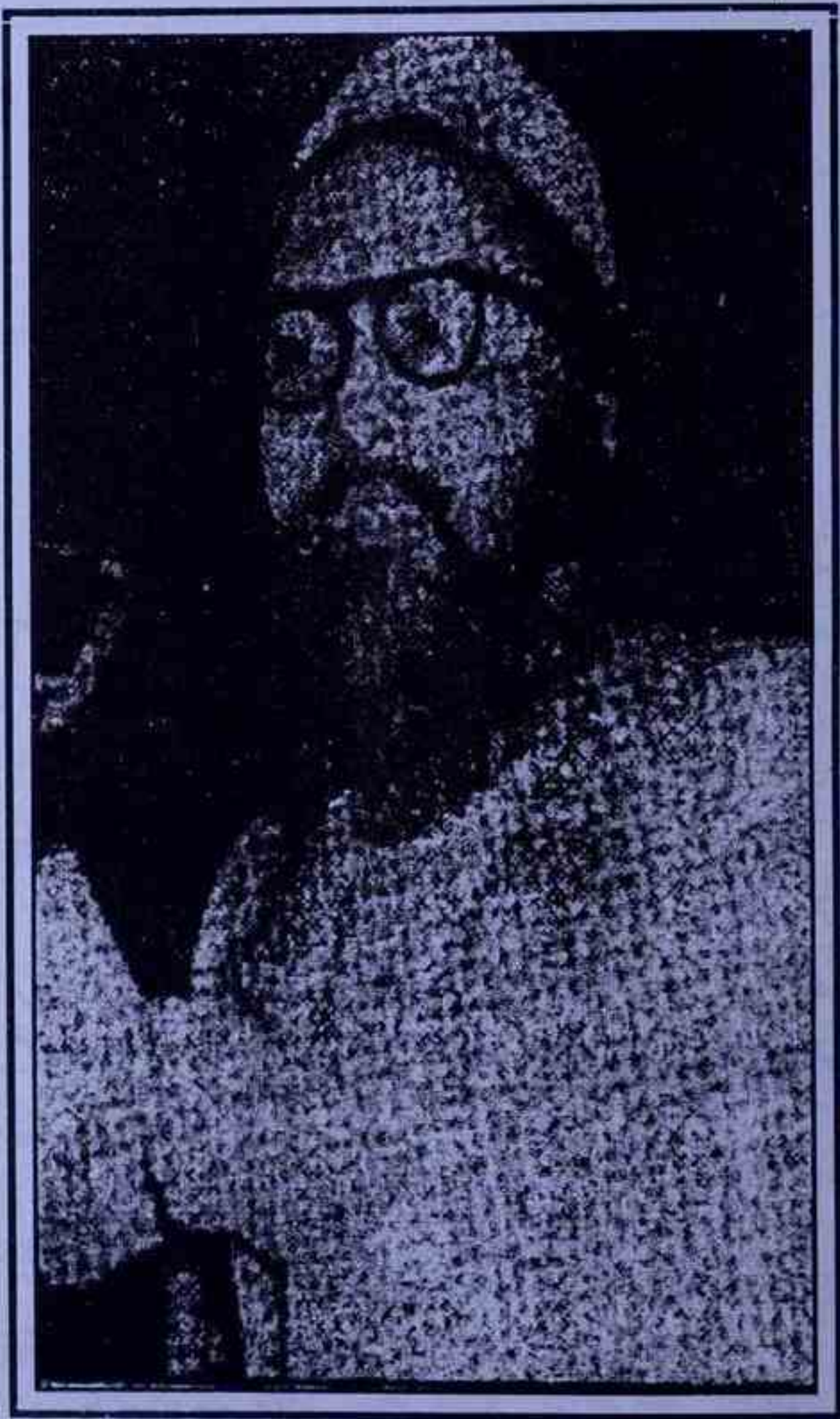
انور صابری

انور صابریؔ

اللہ بخشے انور صابریؔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ دوسروں کو متاثر کرنا اور اپنی اہمیت کا لوہا منوانا انہیں خوب آتا تھا۔ انہوں نے اپنی اس صلاحیت کو ایک ہنر کی طرح بنایا سنوارا تھا اور مبالغہ اور حقیقت کے ملاپ سے اسے نکھارا تھا۔ ان کے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کو دیکھ کر ایک بار فراقؔ نے برسرِ مشاعرہ کہا تھا۔ بھئی کمال ہے ہندوؤں کے دیوتا گنیش نے اس بار مسلمان کے گھر میں اوتار لیا ہے۔

اسی ڈیل ڈول کے ساتھ انور صابریؔ ایک دفعہ علی گڑھ میں اپنے نوجوان مداحوں کے مجمع میں ایک راستے سے گزر رہے تھے کہ اچانک نیم کی چھاؤں تلے ایک کتبہ لگی چھوٹی سی لحد دیکھ کر رک گئے اور اس کی طرف رخ کر کے بولے، وعلیکم السلام یا صاحب قبر۔ اور اسی کے ساتھ قریب جا کر فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ جب وہ وہاں سے پلٹے تو ایک لڑکے نے پوچھا۔

''مولانا کیا آپ صاحب قبر کو جانتے ہیں''؟

''روح والے روح والوں کو روز ازل سے پہچانتے ہیں صاحب زادے۔ انہوں نے میری آہٹوں سے مجھے پہچانا اور سلام کیا، میں نے جواب دے کر روایت کا احترام کیا''

لڑکے نے حیران آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا ''یہ تو درست ہے، لیکن صاحب قبر کی زبان آپ نے کیسے سمجھ لی''؟

کیا مطلب؟ انہوں نے بھاری آواز میں سوال کیا؟

لڑکا مسکراتے ہوئے بولا۔ حضرت مطلب یہ ہے کہ جب تک یہ بزرگ حیات تھے تو ان کی زبان بھی اپنے ہم جنسوں کی طرح ''بھوں بھوں'' تھی۔ آپ نے صاحب قبر کا احترام تو کیا لیکن قبر پر لگا کتبہ نہیں دیکھا۔ اس قبر میں ایک انگریز آرمی آفیسر کا الیشین کتا دفن ہے!

کوئی بات نہیں صاحب زادے' شکلیں جدا ہوتی ہیں لیکن نور سب میں ایک ہی ہے۔ کتا، انسان چرند پرند، مچھلی درخت انسان سب اسی کے فرمان کا اعلان ہیں۔ انور صابری نے جواب دے کر پھر سے سگریٹ سلگائی اور آگے بڑھ گئے۔

انور صابری جسم سے لمبے چوڑے افغانی' سانولے رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی' موٹے سے کپڑے کے ڈھیلے ڈھالے گھٹنوں سے نیچے لبادہ نما کرتے سے حافظ وخیام کے زمانے کے ایرانی اور چہرہ پر جھولتی داڑھی اور سر پر الجھے الجھے کالے سفید بالوں سے کوئی ناقہ سوار ریگستانی لگتے تھے۔ اپنے اس حلیہ میں جب مشاعروں میں تشریف لاتے تھے تو سب سے الگ نظر آتے تھے۔ آواز میں کھنک اور سر دونوں تھے۔ مخصوص ترنم میں شعر سناتے تھے۔ لیکن کلام سنانے سے پہلے ماحول بنانے کے لئے مختصر سی تقریر بھی ضرور فرماتے تھے۔ ان تقریروں میں ہر بار اپنی سیاسی کارگذاریوں کو موضوع بناتے تھے اور اس وقت اسٹیج پر یا سامعین میں جو بھی سیاسی رہنما نظر آتا اس سے دوران تقریر کسی جیل میں اپنے ساتھی ہونے کا رشتہ لگاتے تھے اور تالیاں بجواتے تھے پھر جب غزل سناتے تھے تو بیچ بیچ میں نئے نئے جملے بھی چپکاتے جاتے تھے اور اس طرح مشاعرہ میں چھا جاتے تھے۔ سامعین انہیں بار بار پڑھواتے تھے۔ غضب کے حاضر جواب تھے'' ماہر کھلاڑی کی طرح مجمع سے فٹ بال کی طرح کھیلتے تھے مجال ہے کوئی ان پر جملہ آئے اور خالی جائے۔ ایک مشاعرہ میں کسی منچلے نے آواز لگائی مولانا داڑھی کیوں بڑھائی؟ فوراً ان کے جواب کی آواز آئی

میرے چہرہ پہ تو داڑھی کے اضافہ پہ نہ جا
خط کے مضمون کو پڑھ خط کے لفافے پہ نہ جا

کبھی کبھی کلام پر سننے والوں کی خاموشی کو بھی وہ اپنے جملوں سے پرشور بنا دیتے تھے۔

ایک بار ایک کیمرہ مین نے ان کی تصویر لینی چاہی' انہوں نے یہ دیکھ کر اپنے چہرہ کو ہاتھ کی اوٹ میں چھپا کر کہا۔ میاں تصویر بناؤ گے یا اس سے بچوں کو ڈراؤ گے۔ ان کی ترکی بہ ترکی میں طنز کم ہوتا تھا مزاح زیادہ ہوتا تھا جو محفل کو زندہ اور چونچال رکھتی تھی۔ انور صابری صرف مشاعرہ پڑھتے نہیں تھے۔ مشاعرہ دکھاتے بھی تھے۔ مشاعرہ میں ان کی آمد مشاعروں کی کامیابی کی ضرورت سمجھی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جگر کے ترنم کی دھوم تھی۔ اور کم تعلیم کے اکثر نوجوان صرف آواز کے بل بوتے پر مشاعروں کو پیشہ بنا رہے تھے اور آسان عام فہم کلام کا سکہ چلا رہے تھے۔ انور صابری نے اپنی شاعری کو سیاست اور کلاسکی شعری روایت صحافتی وضاحت اور الفاظ کی مستعمل روایت کے اشتراک سے سجایا تھا۔ سیدھا سیدھا اکہرا لہجہ' تبلیغی انداز اور گلے بازی کا اعجاز۔ سب گھل مل کر وہ سماں باندھتے تھے کہ وہ جب تک اسٹیج پر ہوتے عوام انہیں کے اشاروں پر ناچتے تھے۔

اک برہمن ہے ایک شیخ حرم: دو بزرگوں میں ہاتھا پائی ہے
میں تو ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں: یار لوگو یہ جگ ہنسائی ہے۔

چپ وہ بھی رہے چپ ہم بھی رہے فریاد زباں پر لا نہ سکے
مجبوری دل کو کیا کہیئے وہ آ نہ سکے ہم جا نہ سکے

وجہ بربادی دل پوچھ رہی ہے دنیا
لب پہ کیا جانیے کیوں آپ کا نام آتا ہے

دل نا کام سہی پھر بھی تو میرا دل ہے
یہی نا کام برے وقت میں کام آتا ہے

انور صابری مشاق اور زور گو شاعر تھے مشاعروں کے سامعین کو نظر میں رکھ کر شعر کہتے تھے۔ ان کی حیات میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ ان میں ایک مجموعہ وہ بھی تھا جو برطانوی راج' کے نام سے چھپا تھا۔ جس میں انگریز حکومت کے خلاف نظمیں تھیں اور حکومت وقت نے ضبط کرلیا تھا۔ ان کا کلام ملک کے مشہور قومی اخباروں اور رسائل جیسے زمیندار، رفارمر،

ہمدرد، ایوان ملت اور الہلال وغیرہ میں نمایاں طور پر چھپتا تھا۔ اپنی اشتعال انگیز تقریروں اور برٹش حکومت کے خلاف اپنی وضاحتی اور راست نظموں کی وجہ سے وہ کئی بار جیل بھی بھیجے گئے۔ سیاست اور شاعری سے ان کا رشتہ جو ۱۶ سال کی کچی عمر سے شروع ہوا تھا ۸۴ برس کی پختہ عمر تک مسلسل جاری رہا۔ وہ دیو بند تہذیب کا معیار تھے اور سیکولرزم اور نیشنلزم کی زندہ یادگار تھے۔

انور صابری نسلاً افغانی تھے۔ ان کے اجداد کئی پشتوں پہلے بخارا سے ہجرت کر کے غیر منقسم پنجاب کے ایک علاقہ پاک پٹن میں آ کر بسے تھے۔ یہیں ۱۹۰۰ء میں سید شاہ عین الحق کے گھر میں سید برہان الحق پیدا ہوئے جو بعد میں اپنی کوششوں اور صلاحیتوں سے انور صابری بن گئے انور صابری کے بچپن میں ہی ان کے والد پاک پٹن چھوڑ کر دیو بند چلے آئے تھے۔ یہاں کے ایک مقامی اردو مڈل اسکول میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی بعد میں دارالعلوم دیو بند کے طالب علم ہوئے۔ لیکن تعلیم مکمل ہونے سے پہلے اُن کی خوش آوازی نے انہیں شاعر بنا دیا اور وہ صدر مدرس انور شاہ کشمیری کو کلام دکھانے لگے اور دور پاس کے مشاعروں میں بلائے جانے لگے۔ انہیں دنوں مین مولانا مدنی سے قریب ہوئے اور تحریک امراء کے فعال رکن بن گئے۔ ادب میں سیاست کی شمولیت نے ان سے کچھ ایسی نظمیں بھی کہلوائیں جو بہ یک وقت مشاعرہ اور وقت کی ضرورت کو پورا کرتی تھیں۔ وہ سیاسی اجتماعات میں جس شعلہ نوائی کے ساتھ تقریر فرماتے تھے اسی کے منظوم روپ سے بزم سخن میں داد پاتے تھے۔ ادب وسیاست کے رشتہ کا اکہرا پن کئی ترقی پسند شعراء میں بھی نمایاں ہے۔ انور صابری کی ایسی نظموں میں جوش کی لفاظی کا ہنر بھی ہے اور ظفر علی خاں کے طرز کلام کا اثر بھی ہے۔ لیکن الفاظ تقریری زیادہ ہیں تصویری کم،

عزیز نام جہاں انقلاب زندہ باد
پلٹ نظام جہاں انقلاب زندہ باد
جس انقلاب میں مزدور کامیاب نہیں

وہ انقلاب کبھی میرا انقلاب نہیں

غلام قوم کا دل بھی غلام ہوتا ہے

غلام قوم کا سجدہ حرام ہوتا ہے

انور صابری صرف دیکھنے کی حد تک ہی مولویانہ تھے، ویسے طبیعت سے وہ شاعرانہ اور بوہیمانہ تھے۔ ان کی شخصیت جدید و قدیم کے سنگم کی بہار تھی اس میں وہ ادبی روایت بھی حصہ دار تھی جو جاگیردارانہ عہد کی پیداوار تھی اور جو میرؔ کے کئی شعروں میں آشکار تھی۔ میر کا شعر ہے۔

اک نسخۂ عجیب ہے لڑکا طبیب کا

کچھ غم نہیں ہے اس کو جو بیمار ہو کوئی

میرؔ کی اس روایت کی پاسداری کبھی کبھی بڑی دشواری پیدا کر دیتی تھی۔ ایک بار ایک فرزند طبیب نے بیچ مشاعرہ میں چائے میں جمال گوٹہ ملا کر انہیں ایسا نسخہ پلایا کہ دو دن تک انہوں نے میرؔ کا صرف ایک شعر ہی بار بار دہرایا۔

میرؔ ہر چند میں چاہا لیکن ، نہ چھپا عشق طفلِ بد خو کا

انور صابری مولانا تھے۔ ان کے نام کے ساتھ ان کے پرستار علامہ بھی لگاتے تھے۔ مشاعروں میں ان کے تعارف میں، ان کے نام کے ساتھ مجاہدِ آزادی اور محبِ وطن کے لاحقے بھی شامل کیے جاتے تھے۔ ان کے تعلقات کا دائرہ وسیع تھا۔ ان میں اور بہت سی اہم ہستیوں کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد اور مہاتما گاندھی بھی شامل تھے۔ مولانا آزاد سے، دہلی میں قیام کے دوران، ان کی روز ملاقات بھی ہوتی تھی۔ گاندھی جی سے وہ وردھا جیل میں ۱۹۳۰ میں ملے تھے۔ پہلی ملاقات سے تاحیات وہ ان کے عقیدت مند رہے۔

گاندھی جی سے اپنی عقیدت کا اظہار انہوں نے اپنی ایک نظم میں کیا ہے۔ اس نظم کا پہلا شعر یوں ہے۔

وہ آندھی جو ہواؤں سے کبھی رکتی نہیں دیکھی

قضا کے سامنے گردن کبھی جھکتی نہیں دیکھی

ابوالکلام آزاد نے دہلی کے ایک مشاعرہ میں سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے بارے میں کہا تھا۔ انور صابری کو سنو' اگر تم ان کی آواز نہ سنو گے تو وقت کے فرشتے ضرور سنیں گے اس لیے کہ ان کی ہر بات میں دل کی بات ہوتی ہے۔''

پتہ نہیں مولانا آزاد نے یہ جملہ دل سے کہا تھا'' یا مشاعرے کا ماحول بنانے کے لئے تراشا تھا۔

انور صابری باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جس مشاعرہ میں ہوتے تھے۔ اس میں ایک ساتھ دو مشاعرے چلتے تھے۔ ایک مشاعرہ وہ ہوتا تھا جس میں شاعر مائک سے سامعین کو کلام سناتا تھا۔ اور دوسرا وہ ہوتا تھا جس کو اسٹیج پر کسی کونے میں بیٹھے انور صابری، اپنے ارد گرد بیٹھے لوگوں کو فی البدیہہ شعروں سے جماتے تھے ان شعروں میں وہ ہر شاعر پر اپنی، غیبت کا ہدف بناتے تھے اور تبصرہ فرماتے تھے۔ لال قلعہ میں جشنِ آزادی کے مشاعرہ میں سر شنکر لال شنکر شعر سنا رہے تھے انھوں نے مائک سے شعر پڑھا۔

غنچہ جو کوئی چٹخا یہ کہہ کے اڑا بلبل
اٹھ خواب سے او غافل ہنگام سحر آیا

انور صابر نے اپنے قریب کے لوگوں کو اسے بدل کر اس طرح سنایا۔ اور شاعر کی دولت مندی کا مذاق اڑایا

شنکر کی غزل سن کر محفل یہ پکار اٹھی
شہرت کا تمنائی ایک طالب زر آیا

ایک مشاعرہ میں مترنم شاعر بسمل شاہجہانپوری بڑی پاٹ دار آواز میں سنا رہے تھے

یہ نہیں ساز کی آواز کی محفل کی غزل

نامِ قاتل سے ہے منسوب یہ بسمل کی غزل

اور انور صابری اس کی یوں اصلاح فرما رہے تھے

نہ یہ تنہائی کا نغمہ ہے نہ محفل کی غزل
صرف آواز ہی آواز ہے بسمل کی غزل

حالانکہ وہ آواز اور الفاظ کے فرق کو پہچاننے کے باوجود تاعمر الفاظ پر آواز کا ملمع چڑھا کر ہی مشاعروں کا کاروبار چلاتے رہے۔

انور صابری زندگی کے ۸۴ سال پورے کر کے دیوبند کے ایک قبرستان میں آرام فرما ہیں۔ ان کے ساتھ ماضی کے مشاعروں کی ایک طویل تہذیب دو قومی نظریہ کی مخالف سیاست اور انسانی محبت کی سیکولر روایت بھی مدفون ہے۔

کوئی سنے نہ سنے انقلاب کی آواز
پکارنے کی حدوں تک تو ہم پکار آئے

شکیل بدایونی

شکیل بدایونی

شیکسپیئر نے ۱۵۹۳ اور ۱۶۰۰ کے درمیان ایک سو چون ۱۵۴ سانیٹ بھی لکھے تھے۔ ان میں ایک سانیٹ میں اس نے اپنی محبوبہ کے حسن کے بارے میں کچھ مصرعے تحریر کیے تھے۔

ان کا آزاد ترجمہ یوں ہے

میرے لفظوں میں یہ طاقت کہاں

جو تیری آنکھوں کی تصویر بنائیں

تیرے حسن کی ساری خوبیاں دکھائیں

اگر یہ ممکن بھی ہو، تو آنے والے زمانے میں

کس کو یقین آئے گا

کہ تیرے جیسا کوئی زمیں کی زینت تھا

تو خواب نہیں ایک حقیقت تھی

شکیل بدایونی کی شخصیت، گفتگو کا انداز اور مشاعروں میں ان کی شعر خوانی کا اعجاز ان کو دیکھنے اور سننے والوں کے لئے ایسا ہی تجربہ تھا۔ آج ان خوبیوں کے ساتھ وہ بھلے ہی داستانوی کردار محسوس ہوں لیکن بیتے ہوئے زمانے میں وہ چلتی پھرتی حقیقت تھے۔ خوال سنگر جیت سے تعلق سے میں نے ایک مضمون میں لکھا تھا۔ ان کی آواز اتنی خوبصورت ہے کہ انہیں جب سنا جاتا

ہے تو سننے والا ان کی طرزوں کی یکسانیت کو بھول جاتا ہے۔ شکیل کی خوش پوشی اور شعر خوانی جب مشاعروں کے اسٹیج پر جگمگاتی تھیں تو اچھی اچھی شائستہ سماعتیں بھی ان کے الفاظ کے روایتی برتاؤ اور شعروں کے اکہرے یا تقلیدی سبھاؤ کو بھول جاتی تھیں۔ وہ مشاعروں کے مقبول ترین شاعر تھے۔ وہ جس مشاعرہ میں آتے تھے اپنے پڑھنے کے بعد سارا مشاعرہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ان کے زمانے میں کئی مترنم شاعر مشاعروں کی زینت تھے۔ فنا نظامی، شعری بھوپالی، دل لکھنوی، راز مراد آبادی، مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی وغیرہ سب عوامی محفلوں کی ضرورت تھے، مگر ان میں شکیل کبھی کبھی کے جلوہ کی مانند زیادہ دل نواز شخصیت تھے۔ فلموں میں نغمہ نگاری کی مصروفیت انہیں زیادہ مشاعرہ بازی کی اجازت نہیں دیتی تھی اقتصادیات کے اصول کے مطابق اگر سپلائی کم ہو تو قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مشاعروں میں ان کی شہرت سے ہی متاثر ہو کر موسیقار نوشاد علی نے انہیں فلموں میں لکھنے کے لیے بلایا تھا۔ شاعر وہ فلموں میں آنے سے پہلے بھی تھے۔ لیکن اس وقت تک ان کی شاعری یوپی کے چند علاقوں تک ہی محدود تھی۔ فلمی گلیمر نے اس میں چار چاند لگا دیے تھے اور ان کے الفاظ ملک کے کونے کونے تک پہونچا دیے تھے۔

شکیلؔ کا اصل نام شکیل احمد تھا۔ تاریخی نام غفار احمد اور تخلص شکیل بدایونی۔ شکیل کے والد مولانا جلیل احمد قادری، بدایوں کے ایک بلند مرتبہ عالم اور واعظ تھے۔ گھر کا ماحول گہرا مذہبی اور شاعرانہ تھا۔ ان کے والد شاعر تھے بھی اور سوختہ تخلص سے شعر کہتے تھے۔ چچا ضیاء القادری نعت و منقبت کے استاد شاعر تھے۔ ان کی تحریر کردہ شرح کلام مومنؔ ایک زمانہ میں بحث و مباحثہ کا موضوع تھی۔ شکیلؔ اگست ۱۹۱۶ء میں بدایوں (یوپی) میں پیدا ہوئے اور مولانا ضیاء القادری کی رہنمائی میں چودہ برس کی عمر سے شعر گوئی کی ابتدا کی۔ بدایوں میں اردو فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شکیل کا تعلیم کا سلسلہ بدایوں، ممبئی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جاری رہا۔ لیکن والد کی رحلت نے جن گھریلو الجھنوں نے انہیں الجھا دیا تھا۔ ان کی وجہ سے بی اے کے بعد انہیں ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اور وہ دہلی میں محکمہ سپلائی میں کلرکی کرنے لگے۔

شکیلؔ کی شہرت میں ان کے ترنم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ جس دور میں شعر کہہ رہے تھے وہ

یگانہ، فراق، اور شاد عارفی کی نئی غزل اور جوش، فیض اور اختر الایمان کی نظم میں نئی تبدیلیوں کا دور تھا۔ نئی شعری زبان گڑھی جا رہی تھی نئے بیتی تجربوں اور انفرادی مشاہدوں سے فضا جگمگا رہی تھی۔ ترقی پسند تحریک اپنے شباب کا جشن منا رہی تھی۔ ساتھ میں حلقۂ ارباب ذوق میں شاعری نئے تیور دکھا رہی تھی لیکن اس وقت شکیل کی شاعری اسی شعری روایت کا ساتھ نبھا رہی تھی جو داغ کے بعد نسل در نسل دہرائی جا رہی تھی اور مشاعروں میں دھومیں مچا رہی تھی۔ وہ ادب میں بزرگوں کی وراثت کے پاسدار تھے اور نئے زمانہ میں اگلے دنوں کی یادگار تھے۔ ان کے اشعار مانوس لفظوں میں رائج موضوعات کی شناسا شباہتوں کے چتر کار تھے۔ ان کا لہجہ دھیما خوش آہنگ اور کلاسکی آداب کا اعتبار تھا۔

کیا کیجئے شکوہ دوری کا ملنا بھی غضب ہو جاتا ہے
جب سامنے وہ آجاتے ہیں احساس ادب ہو جاتا ہے

کوئی آرزو نہیں ہے کوئی مدعا نہیں ہے
ترا غم رہے سلامت مرے دل میں کیا نہیں ہے

لب صرف تکلم ہیں تو نظریں ہیں کہیں اور
ان باتوں سے ہوتا ہے محبت کا یقیں اور

دانستہ سامنے سے جو وہ بے خبر گئے
دل پر ہزار طرح کے عالم گذر گئے،

ان کے پہلے مجموعہ رعنائیاں میں ایسے ہی چند شعروں کی بنیاد پر جگر مرادآبادی نے اپنے مقدمہ میں شکیل کی یوں ہمت افزائی کی تھی۔

''اس طرح کے چند اشعار بھی اگر کوئی شخص زندگی بھر میں کہہ دے تو میں اسے صحیح معنوں میں شاعر تسلیم کرنے کو تیار ہوں۔

ان کے ایک اور شعری مجموعے میں جو رنگینیاں کے نام سے نیا ادارہ لاہور سے ۱۹۶۱

میں شائع ہوا تھا مشہور نغمہ نگار اور شاعر ساحر لدھیانوی نے ان کی شاعری کو سراہتے ہوئے لکھا تھا۔

''شکیل کسی مخصوص مدرسہ فکر یا جماعتی نظریے کے پابند نہیں ہیں' وہ ایک مخلص اور حساس فنکار کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں اسے زبان و بیان کی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ ان کی آواز ایک مصلح کی آواز نہیں ایک مطرب کی آواز ہے۔ ان کی اہم خصوصیت بیان کی جاذبیت اور احساس کی شدت ہے۔

شکیل مشاعروں میں اکیلے نہیں آتے تھے جہاں بھی بلائے جاتے تھے۔ اپنے مداحوں اور شاگردوں کا پورا قافلہ اپنے ساتھ لاتے تھے۔ ان میں شفا گوالیاری، صبا افغانی، قمر بھساولی اور بہت سے چھوٹے بڑے شاعر ہوتے تھے۔ ان سب کے اخراجات مشاعرہ کمیٹی کے ذمے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ کافی مہنگے شاعر تھے۔ لیکن ان کی آمد ہر شہر کے لیے ایسا ادبی واقعہ سمجھا جاتا تھا جو برسوں دہرایا جاتا تھا۔ میں نے پہلی بار انہیں گوالیار میں میلے کے مشاعرے میں دیکھا اور سنا تھا۔ گرم سوٹ اور ٹائی بالوں کی خوش ادائی اور چہرے کی رعنائی سے وہ شاعر سے زیادہ فلمی ادا کار نظر آتے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے وہ پنڈال میں اپنے مداحوں اور شاگردوں میں گھرے اپنے مداحوں کو آٹوگراف سے نواز رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ قلم کی لکھاوٹ کا ساتھ دے رہی تھی۔ شکیل کو اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کی ہر حرکت اور اشارہ پر لوگوں کی نظر ہے۔ وہ کیمرہ کے سامنے کسی ایکٹر کی طرح نپے تلے انداز میں کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے تھے۔ یوں ہی مسکراتے تھے یوں ہی سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ اس مشاعرہ میں داغ کے آخری دنوں کے ممتاز شاگرد عمدۃ الشعراء حضرت ناطق گلاؤٹھوی کو بھی ناگپور سے بلایا گیا تھا۔ لمبے پورے پٹھانی جسم اور باریش روشن چہرے کے ساتھ وہ جیسے ہی پنڈال میں اندر داخل ہوئے سارے لوگ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ شکیل ان بزرگ کے مزاج سے شاید واقف تھے وہ انہیں دیکھ کر ناطق صاحب کا ہی ایک مشہور مطلع پڑھتے ہوئے ان سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھے

وہ آنکھ تو دل کو لینے تک بس دل کی ساتھی ہوتی ہے

پھرلے کر رکھنا کیا جانے دل لیتی ہے اور کھوتی ہے

لیکن مولانا ناطق اس مدح سراحی سے خوش نہیں ہوئے۔ ان کے ماتھے پر انہیں دیکھتے ہی بل پڑنے لگے۔ وہ اپنے ہاتھ کی چھڑی کو اٹھا اٹھا کر کسی اسکول کے استاد کی طرح بھاری آواز میں بول رہے تھے برخوردار میاں شکیل تمہارے تو والد بھی شاعر تھے اور چچا مولانا ضیاء القادری بھی مستند استاد شاعر تھے۔ تم سے تو چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی توقع ہمیں نہیں تھی۔ پہلے بھی تمہیں سنا پڑھا تھا۔ مگر کچھ دن پہلے ایسا محسوس ہوا۔ تم بھی انہیں ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے ہو جو روایت اور تہذیب کے دشمن ہیں۔''

شکیل اس اچانک یلغار کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ گھبرا گئے۔ لیکن بزرگوں کا احترام ان کی سرشت کا حصہ تھا۔ وہ سب کے سامنے اپنی تنقید کو مسکراہٹ سے چھپاتے ہوئے ان سے پوچھنے لگے۔ ''قبلہ آپ کی شکایت درست ہے لیکن براہ کرم غلطی کی نشاندہی بھی کر دیں تو مجھے اس کی اصلاح کرنے میں آسانی ہوگی۔ آپ فرمائیں کہاں مجھ سے بھول ہوئی ہے۔''

برخوردار آج کل تمہارا ایک فلمی نغمہ ریڈیو پر اکثر سنائی دے جاتا ہے اسے بھی کبھی کبھار مجبوراً ہمیں بھی سننا پڑتا ہے اس کا پہلا شعر یوں ہے۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو کچھ بھی خدا کی قسم لاجواب ہو

میاں ان دونوں مصرعوں کا وزن الگ الگ ہے۔ پہلے مصرع میں ''تم'' لگا دینے سے یہ عیب دور کیا جا سکتا تھا۔ کوئی اور ایسی غلطی کرتا تو ہم نہیں ٹوکتے۔ مگر تم ہمارے دوست کے فرزند ہو ہمیں عزیز بھی ہو اس لئے آگاہ کر رہے ہیں۔ بدایوں چھوڑ کر ممبئی میں بھلے ہی بس جاؤ مگر بدایوں کی وراثت تو نبھاؤ۔

شکیل اپنی صفائی میں فلموں میں موسیقی اور الفاظ کے رشتہ کی پیچیدگی کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی دلیلیں کافی معلوماتی اور معقول تھیں۔ لیکن مولانا ناطق نے ان سب کے جواب میں صرف اتنا کہا۔ میاں ہم نے جو منیر شکوہ آبادی اور بعد میں مرزا داغ سے سیکھا ہے اس کے مطابق تو

یہ غلطی ہے اور ناقابل معافی غلطی ہے۔ ہم تو تم سے یہی کہیں گے ایسے پیسے سے کیا فائدہ جو رات دن فن کی قربانی کا تقاضہ کرے۔"

اس مشاعرہ میں ناطقؔ صاحب کو شکیلؔ کے بعد زحمت کلام دی گئی تھی۔ ان کے کلام شروع کرنے سے پہلے شکیلؔ نے خود مائک پر آکر کہا تھا۔ حضرت ناطقؔ ادب کی تاریخ کا زندہ کردار ہیں۔ ان کا کلام پچھلی کئی نسلوں سے زبان و بیاں کا جادو جگا رہا ہے۔ فن کی باریکوں کو سمجھنے کا سلیقہ سکھا رہا ہے اور مجھ جیسے ادب کے نوواردوں کو راستہ دکھا رہا ہے۔ میری درخواست ہے آپ انہیں اسی احترام سے سماعت فرمائیں جس کے حضرت مستحق ہیں۔

شکیلؔ وضعدار انسان تھے۔ ان کے مزاج کا انکسار ان کی مذہبی اقدار کا اعتبار تھا۔ وہ ترقی پسندوں کے مخالف تھے اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا وہ اس مخالفت کے اکیلے محاذ کے اکیلے رہنما تھے۔ اپنی ایک نظم فصیح الملک داغ کے حضور میں انہوں نے سائل دہلوی بے خود، سیماب اور نوح ناروی وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے داغ کی تربت سے وعدہ بھی کیا تھا

یہ داغ داغ کی خاطر مٹا کے چھوڑیں گے: نئے ادب کو فسانہ بنا کے چھوڑیں گے۔

پتہ نہیں انہوں نے نئے ادب کو فسانہ بنایا یا خود اس مخالفت میں افسانہ بن گئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنے آخری زمانے میں وہ ادب کی ان تبدیلیوں سے متاثر ہونے لگے تھے۔ جو شروع میں انہیں پسند نہیں تھیں۔ غزل میں نئے لفظوں کی کھپت اور موضوعی ندرت ان کی روایت زدگی قبول کرنے لگی تھی۔ لیکن اس تبدیلی کو سنوارنے نکھارنے کی انہیں فرصت نہیں ملی۔

عجب ہوتی جاتی ہے کچھ حالت دل: کوئی چھین لے جیسے پڑھتے میں ناول

میری بربادی کو چشم معتبر سے دیکھیے
میرؔ کا دیوان غالبؔ کی نظر سے دیکھئے

اللہ تو سب کی سنتا ہے جرأت ہے شکیلؔ اپنی اپنی

حالؔی نے زباں سے کچھ نہ کہا اقبالؔ شکایت کر بیٹھے

شکیلؔ کی حیات میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ رعنائیاں شبستاں' صنم وحرم' رنگیناں ان میں چند کے نام ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے ان مجموعوں کے ساتھ ایک نعت و منقبت کا مجموعہ نغمہ فردوس کے نام سے بھی شائع ہوا تھا۔ ان کی آخری غزل جو بستر علالت کی تخلیق تھی اس کا مقطع ہے۔

وہ اٹھے ہیں لے کے خم وسبو، ارے اے شکیلؔ کہاں ہے تو
ترا جام لینے کو بزم میں کوئی اور ہاتھ بڑھا نہ دے
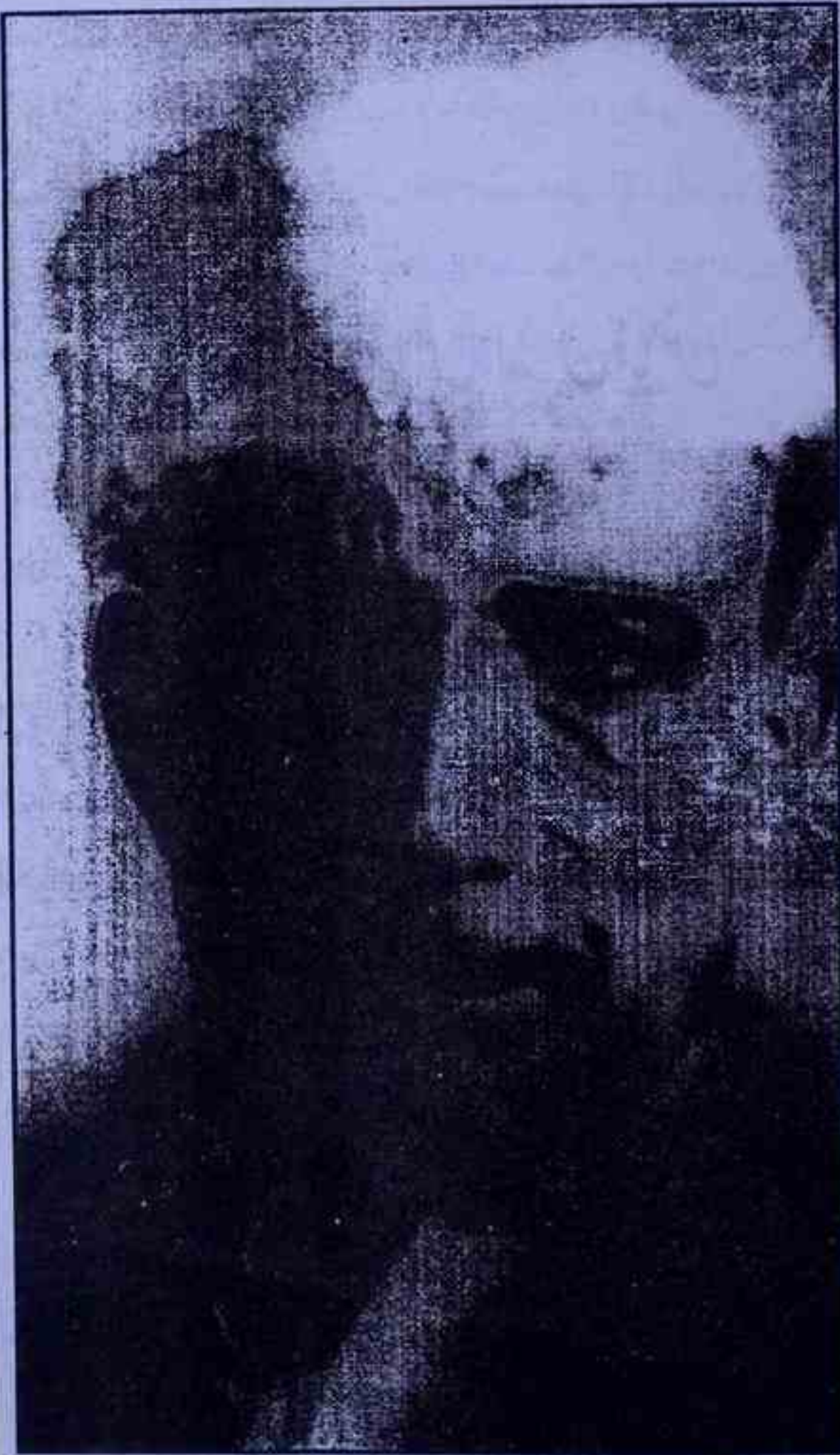
فیاض گوالیاری

شاعرِ وطن۔ فیاض الدین فیاض

محمد فیاض الدین احمد خاں فیاض ۲۱/ اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ضلع شوپور کے ایک قصبہ کولارس میں پیدا ہوئے جوان دنوں سندھیا کی ریاست کا حصہ تھا۔ وہ اسی رعایت سے اپنے تخلص کے ساتھ گوالیاری لگاتے تھے۔

گوالیار کا ادبی شجرہ شاہ مبارک آبرو (۱۷۰۰۔۱۷۵۰) سے شروع ہوتا ہے۔ وہ مرزا جانِ جاناں کے ہم عصر تھے۔ دونوں کی معاصرانہ چشمک کے تعلق سے 'آب حیات' میں دو شعر درج ہیں۔ آبرو کی ایک آنکھ میں کچھ خرابی تھی۔ اسی پر طنز کرتے ہوئے جانِ جاناں کا ایک نخش شعر یوں ہے۔

آبرو کی آنکھ میں اک گانٹھ ہے
آبرو سب شاعروں کی ...... ہے

اس کے جواب میں آبرو نے بھی اسی لہجہ کو اپناتے ہوئے کہا۔

کیا کروں حق کے کیے کو، کور میری چشم ہے، آبرو جگ میں ہے تُو، تو جانِ جاناں پشم ہے

میر حسن، مصحفی اور فتح علی وغیرہ نے اپنے تذکروں میں ان کی مدح سرائی کی ہے۔ رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں ان کے بارے میں لکھا ہے۔

شاہ آبرو متقدین شعراء میں استعارات اور ایہام کے بادشاہ ہیں۔

''آبِ حیات'' میں انہیں ولی کے بعد دوسرے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

فیاض نے جب ہوش سنبھالا اس وقت گوالیار مرزا داغ اور امیر نیائی کے شاگردوں کی شاعری سے روشن تھا۔ ان میں نارائن پرشاد مہر، حب لال رعد (شاگردان داغ) اور مضطر خیر آبادی (شاگرد امیر مینائی) کا اپنے دور کے استادوں میں شمار تھا۔ غزل حاوی صنفِ سخن تھی اور مجموعی شعری مزاج روایت کی وراثت سے عبارت تھا۔ اس شعری روایت سے انحراف کی جو آوازیں اس عہد میں نمایاں ہوئیں، ان میں جاں نثار اختر، رضا قریشی اور فیاض گوالیاری کے نام اہم ہیں۔ جاں نثار اختر، علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے آئے تھے، اور مجاز اور جذبی کی صحبتوں کی سرشاریاں اپنے ساتھ لائے تھے۔ فیاض نے گوالیار سے ہی بی۔ اے کیا اور لفظ و معنی کے بدلتے رشتوں کا ساتھ دیا۔ ان کی غزل اور نظم پر حالی کے اصلاحی گداز اور جوش کے پرشور الفاظ کے اثرات تھے لیکن گوالیار کی ادبی فضا میں وہ انہیں اثرات کی وجہ سے ممتاز تھے۔

فیاض نسلاً افغانی تھے۔ سترویں صدی کی آخری دہائیوں میں کابل سے ایک قبیلہ جو ملا احمد خاں کی رہنمائی میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ ان کی تاریخ کے پہلے بزرگ تھے۔ وہ ایک فوجی سردار تھے۔ جنگی ہتھیاروں سے اس خاندان کی وابستگی بعد کی تین نسلوں تک مسلسل جاری رہی۔ فیاض کے والد بھی اپنے والد اور دادا کی طرح گوالیار کی فوج میں اہم عہدہ دار تھے۔ فیاض مزاجاً روایت شکن تھے۔ انہوں نے اپنے شعری رویہ کی طرح آبائی پیشہ سے بھی انحراف کیا اور سول سروس کو ذریعہ معاش بنایا۔ سندھیا لینڈ رکارڈ کے شعبہ میں کلرکی سے ابتدا ہوئی اور ایڈیشنل سروے آفیسر مدھیہ پردیش کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

لیکن اس روایت شکنی کے باوجود، فیاض کا نسلی تشخص تین پیڑھیوں کا فاصلہ طے کر کے بھی ان میں تازہ دم تھا۔ ان کے کسرتی بدن، چہرے کے کھڑے نقش، بھوری آنکھیں، بھاری آواز، بات بات پر ناراض ہونے کے انداز، ان کی ہندوستانیت میں دھندلاتی افغانیت کے حوالے تھے۔

گردن تک بند جودھپوری کوٹ، سر پر اونچی باڑھ کی سفید فر کی ترچھی ٹوپی، چال میں

ہچکولے کھاتا بدن، بغل میں تیل پیا ہوا دوفٹ کا ڈنڈا لیے وہ شہر میں جب بھی نظر آتے آپ ہی آپ کبھی تیوریاں چڑھاتے، دکھائی دیتے، کبھی یوں ہی مسکراتے نظر آتے۔ راستے میں سلاموں اور نمسکاروں سے بے نیاز ان کی منزل جو گھر سے نکلنے سے پہلے طے ہو جاتی تھی، درمیان میں کہیں ٹھہرنے کے قائل نہیں تھی۔ اپنے تلے قدموں کی اس رفتار میں تھوڑی سی تبدیلی اس وقت نظر آتی تھی جب کوئی شعر مکمل ہو کر ان کے ہاتھوں میں لہراتا تھا یا دور سے کسی حلوائی کے دودھ کا کڑھاؤ انہیں آواز لگاتا تھا۔ وہ دودھ، مٹھائی اور میووں کے بہت شوقین تھے۔

فیاض گوالیاری میری طالب علمی کے زمانے کے شہر کے مشہور و ممتاز شاعر تھے۔ میں جب ان سے ملا وہ ملازمت سے آزاد ہو کر، سڑک کنارے ایک دومنزلہ مکان میں اکیلے رہتے تھے۔ ان کے دونوں صاحب زادے اپنی ملازمتوں کے علاقوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس گھر میں ان کے علاوہ اب دیواروں پر ٹنگی ہوئی وہ تصویریں تھیں، جو کاغذی ہوتے ہوئے بھی دن بھر اور رات کو دیر تک چلتی پھرتی تھیں اور بولتی رہتی تھیں۔ ان تصویروں سے ان کی بات چیت مسلسل جاری رہتی تھی۔ کبھی یہ تصویریں ان سے بولتی تھیں اور جب یہ بول بول کر تھک جاتی تھیں تو فیاض صاحب ان کے بارے میں بولنے لگتے تھے۔

کچھ مرے دل نے بنایا کچھ نگاہوں نے دیا
ورنہ اس دنیا میں کیا تھا کچھ نہ تھا میرے لئے

ذرہ ذرہ پر مرے سجدے کی مہریں ثبت ہیں
عشق نے کعبے بنائے جا بجا میرے لئے

ان کے ساتھ ایک بڑا عرصہ گذارنے کے بعد بھی یہ تصویریں ان کے لئے پرانی نہیں ہوئی تھیں۔ ان میں چھپی خوشیاں اور دل آزاریاں ان کی تنہائیوں میں آبادیاں جگائے ہوئے تھیں۔

''یہ میری بیگم ہیں، بہت نیک خاتون تھیں۔ گوالیار کے مشہور مصور داؤد کی بیٹی تھیں۔ خدا کے گھر کی زیارت کرنے گئی تھیں۔ بیت اللہ کے حسن و جمال نے ایسے جادو کیا کہ اپنے دو

بیٹوں کے بڑھتے شباب اور میرے سر پر چڑھتے خضاب کو بھول کر، جس کے گھر سے آئی تھیں ہمیشہ کے لئے اسی کے پاس چلی گئیں، خدا انہیں جنت نصیب کرے۔

ہر شخص کا اترا کے برابر سے نکلنا
ایسے میں اکھرتا ہے ترا گھر سے نکلنا
میں آؤنگا جھونکوں میں نسیم سحری کے
تم بھیس میں خوشبوں کے گل ترے نکلنا

''اور یہ لمبی داڑھی والے جگت گرو شنکراچاریہ ہیں، انہوں نے مجھے سُدھرم رتن، کے خطاب سے نوازا ہے اور ان کے برابر چھوٹی سے داڑھی والے، نائب صدر مملکت ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔ بڑی قابلیتوں کے مالک تھے۔ میری شاعری کی وجہ سے مجھ پر بہت مہربان تھے۔ دیکھیے میری گردن میں کس محبت سے ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ اس تصویر کے نیچے جو عبارت ہے وہ انہیں کے ہاتھ کی تحریر ہے''...... فرماتے ہیں۔

فیاض صاحب کا کلام وطنی اور قومی موضوع پر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ موضوع کے ایسے تعین سے شاعری پھیکی پھیکی ہو جاتی ہے۔ مگر اس میں رس ہے۔ صداقت ہے اور اس لئے دلنشین ہے۔ پھر طرز ادا میں بھی پختگی ہے'۔

''وہ سامنے راجندر پرساد ہیں (صدر جمہوریہ ہند) اور ان کے دائیں جانب ملک کے مشہور افسانہ نگار اور بلند مرتبہ حکیم کوثر چاند پوری ہیں۔ ایک دن بغرض علاج ان کے یہاں گیا۔ میرا کلام سنا تو دوائی کے پیسے تک نہیں لئے اور نسخہ کے کاغذ پر ہی میری شاعری کے تعلق سے یہ رائے لکھدی اس رائے کو میں نے تصویر کے نیچے ہی چسپاں کر دیا ہے''۔ سنیے کہتے ہیں۔

فیاض صاحب نظم سے گہری مناسبت رکھتے ہیں، ان کی اکثر نظموں میں واقعیت، صداقتِ بیان، مشاہدہ کی گہرائی اور فکر و خیال کی پختگی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں''

ان ہی تصویروں میں، وہ ایک میں عینی آپا کے ساتھ کھڑے تھے۔ دوسری تصویروں

کے برعکس اس کے نیچے کوئی عبارت نہیں تھی۔اس کی وجہ پوچھنے پر انہوں نے فرمایا۔

''بھئی عجیب خاتون ہیں۔میں نے اپنا نیا مجموعہ وطن ان کی رائے جاننے کے لئے بھیجا تھا، انہوں نے میری گذارش کو بیساکھی سے تعبیر کیا۔لیکن میں نے ان کی تصویر یہاں رکھ کے انہیں پھر بھی سان دیا''۔

ہاتھوں میں لیے زلف کھڑے ہیں وہ خفا سے
چتون سے ٹپکتا ہے کہ لڑتے ہیں ہوا سے

فیاض صاحب عربی، فارسی اور انگریزی میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔گوالیار کے روایت زدہ ماحول میں قومی اور وطنی نظموں کی طرف ان کا رجحان، اس دور میں ان کی جدت پسندی کی دلیل تھی۔حالی اور آزاد کی طرز میں فطرت کے مناظر اور سماج کی تصویر گری اور جوش کے انداز میں قومی اور انقلابی نظمیں، ان کے شعری رویوں کی ترجمان ہیں۔زبان و بیان کی مشاق زیبائی، اور زمینی پیکروں کی رعنائی ان کا حسن ہے جو وضاحتی اور بیانیہ لہجہ کے باوجود قارئین کو متوجہ کرتی ہیں۔ان کی نظم بسنت رت کے ابتدائی مصرعے ہیں۔

ہوئی پہلی کرن سورج کی یوں رقصاں ہمالے میں
پجارن جیسے کوئی صبح دم آئے شوالے میں
گلابی سردیاں آئیں ہوا میں نرمیاں آئیں
سنہری ساعتیں لے کر بسنتی گرمیاں آئیں
سنہری رنگ چھاتا جارہا ہے کونے کونے میں
زمرد جس طرح حل کر رہا ہو کوئی سونے میں

ان کے یہاں وطن دوستی کا تصور شاعرانہ اور مخلصانہ تھا۔اس میں تہذیب و تاریخ کی تہہ داریاں کم تھیں۔

مانوس ہیں جو خطۂ ہندوستاں سے ہم
جنت میں بھی نہ جائیں گے اٹھ کر یہاں سے ہم

ہم مٹے بھی تو جنت نشاں ہو گئے
ذرۂ خاک ہندوستاں ہو گئے

بہت اونچے گئے دیر و حرم کے پوجنے والے
جہاں میں تھا وہیں کی خاک لے کر چوم لی میں نے

ان کی بے ضرر وطن نوازی، برٹش حکومت کو نہیں بھائی، اور اس جرم میں آزادی تک انہیں دفتری ترقیوں سے محروم کر دیا گیا۔ ان کے جونیر ان کے سینئر بن کر کہیں سے کہیں پہونچ گئے، لیکن وہ جہاں سے شروع ہوئے تھے وہیں پڑے رہے۔ فیاض صاحب سرکاری ملازم ہونے کے باوجود، اپنی شاعری کے ذریعہ آزادی کی لڑائی کا ساتھ نبھاتے رہے، لیکن آزادی ملنے کے بعد جب ان کی قربانیوں کو متوقع پذیرائی حاصل نہیں ہوئی تو وہ گلہ مند ہو گئے۔ اس گلہ مندی کا اظہار وہ آخر دم تک اخباروں میں خطوط لکھ کر یا برسر اقتدار رہنماؤں کو اپنے کوائف بھیج کر کرتے رہے۔ لیکن ان کی یہ ساری جدوجہد کمرہ میں ٹنگی چند تصاویر اور ان کے نیچے چسپاں بیانات تک ہی محدود رہی۔ ان سے آگے نہیں بڑھی۔

فیاض صاحب شاعر ہونے کے ساتھ اچھے مترجم بھی تھے۔ اپنی کئی نظموں کے انہوں نے، انگریزی میں ترجمے کیے تھے، جو کئی مقامی اور بیرونی رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ امیر خسرو کی منتخب رباعیوں پر مشتمل ان کی ایک انگریزی کتاب INDIA AS SEEN BY KHUSRO جے پور کے ایک ادارہ، ہسٹری ریسرچ ڈپارٹمنٹ، نے شائع کی تھی۔

فیاض صاحب کا ایک شعر ہے۔

اب بھی تو وہی کج کلہی ہے تیری فیاض
تانے ہوئے سینہ اسی تیور سے ہکنا

فیاض گھر سے باہر اپنے اسی انداز کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اپنے دوستوں کی بیٹیوں کو شوقیہ انگریزی پڑھانا، ان کے لیے قلم کاغذ اور کتابیں خود خرید کرلانا، اور کبھی کبھی ان کے ساتھ کالج یا اسکول تک جانا، اور ساتھ ساتھ جیب سے نکال کر کاجو یا بادام چبانا اور طباعت کو کھلانا ان کے اسی انداز کے تیور تھے۔ ان کے ان تیوروں کی وجہ سے ان لڑکیوں کے ہم عمر لڑکے ان سے خفا بھی رہتے تھے کبھی کبھی ان کی یہ خفگی شعری نشستوں اور مقامی شاعروں میں زیادہ بے حجاب ہو جاتی تھی۔ فیاض صاحب کے پڑھنے کا انداز بھی ان کی شخصیت کی طرح دوسروں سے جدا تھا۔ ترنم اور تحت دونوں میں کلام سناتے تھے۔ آواز میں سُروں کا فقدان تھا، لیکن غزل کے لیے ترنم کو ضروری سمجھتے تھے اور اسی کی وجہ سے پانچ شعروں کی غزل میں کم سے کم دس بارہ بار سامعین سے الجھتے تھے۔ تحت میں آواز بھاری اور گرجدار تھی۔ لیکن آواز اس تیز رفتاری سے الفاظ کو پھلانگتی گذرتی تھی کہ محفل میں ہر سماعت اپنی ست روی پر افسوس کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ شروع ہو جاتے تھی تو غزل ہو یا نظم اسے مکمل کر کے ہی اپنی نشست پر واپس آتے تھے۔ فیاض صاحب پابندی سے شعر کہتے تھے۔ ان کے یہ مشق سخن آخر تک بدستور جاری رہی۔ ان کی غزلوں اور نظموں کے کئی مجموعے تیار تھے۔ انہیں وہ شائع کرانا چاہتے تھے لیکن عمر نے انہیں اس کے لئے مہلت نہیں دی۔ ۷ر اگست (۱۹۸۰) چار بجے حسب معمول اکیلے گھر میں، نماز فجر کے لئے اٹھے۔ اور وضو کرنے کے لئے جیسے ہی گیلری میں گئے، اندھیرے میں پیروں کا توازن بگڑ گیا اور وہ چودہ فٹ نیچے گر پڑے اور پھر دو ڈھائی سال کئی شکستہ ہڈیوں کا عذاب جھیل کر ۷۴ سالہ یہ پُر کشش داستان اچانک خاموش ہوگئی۔

کیوں میری خاک سے کوئی دامن کشاں ہے اب
دامن پکڑ کے روکنے والا کہاں ہے اب

خمار بارہ بنکوی

خمار بارہ نبکوی

مذاق مذاق میں اس دن خمار صاحب کی شیروانی کے دو بٹن شہید ہو گئے تھے۔ اس کا مجھے افسوس تھا۔

ہوا یوں راجستھان کے خوبصورت شہر اودے پور میں مشاعرہ تھا۔ کچھ شاعر آ چکے تھے کچھ آنے والے تھے۔ میں ہوٹل کے ایک کمرہ میں ہندی۔ اردو کے مقامی ادیبوں اور شاعروں اور صحافیوں سے بات چیت میں مصروف تھا کہ اتنے میں ایک بلند قامت موٹا تازہ شخص پولس آفیسر کی وردی میں اندر داخل ہوا اور مجھ سے نہایت بے تکلفی سے تو تکار کے لہجہ میں بات کرنے لگا۔

کیوں بھئی کیسا ہے تو؟ اچھا ہوا تو آ گیا۔ لگتا ہے مجھے نہیں پہچان رہا بیٹا۔ ابے غور سے دیکھ میں تیرے والد کا دوست ہوں۔ میرا نام احمد جمال ہے۔ ڈپٹی پولس کمشنر احمد جمال۔ تیرا باپ مرا لنگوٹیا یار تھا میں نے تجھے ننگا گھومتے دیکھا ہے۔ سمجھا (قہقہہ)

احمد جمال کی تو تکار کا انداز مجھے اچھا نہیں لگا۔ وہ بھی دوسروں کے سامنے۔ والد کا حوالہ سن کر میں خاموش تھا اور یوں بھی، وہ اب اتنی دور جا چکے تھے کہ ان سے اب کچھ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جس بچپن کا وہ ذکر فرما رہے تھے وہ کسے یاد رہتا ہے حالانکہ اس حوالے کے باوجود میں انہیں پہچان نہیں پا رہا تھا۔ میرے مداحوں کے سامنے ان کے طرز تکلم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں اپنے غصہ کو چھپانا بھی چاہتا تھا اور ان پر اپنی اہمیت جتانا بھی چاہتا تھا۔ اچھا ہوا وہ

دو تین چار جملے بول کر چلے گئے۔ میں نے فراغت کی سانس لی لیکن وہ تھوڑی دیر بعد پھر ڈرائنگ روم میں نظر آ گئے۔ اور پھر وہی بے تکلفی اے بتے والی۔ میں نے اسی دوران کھڑکی سے دیکھا خمار صاحب کی ٹیکسی ہوٹل میں اندر آ رہی ہے۔ مجھے اچانک ایک چال سوجھی میں نے فوراً پلٹ کر جمال سے کہا جمال صاحب اچھا ہوا آپ آ گئے۔

کیوں کیا بات ہے؟ کیا چاہیے تجھے۔ انہوں نے دریافت کیا

بھائی جان مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اس وقت اسٹیشن پر خمار صاحب کو آپ کی ضرورت ہے۔ ابھی فون آیا تھا وہ شراب کے نشے میں تھے اور ریلوے پولس نے انہیں لاک اپ میں ڈال دیا ہے میں نے انہیں ٹالنے کے لیے یہ بہانہ تراشا تھا۔

'بدتمیز گدھے، گنوار، جاہل کہیں کے۔ میں ابھی ان کو چھڑا کر لاتا ہوں۔ وہ اول فول بکتے ہوئے الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ لیکن ابھی وہ مشکل سے زینہ کی ایک دو سیڑھیاں ہی اتر پائے تھے کہ اتنے میں انہیں خمار صاحب نظر آ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ گھبرائی آواز میں ان سے پوچھنے لگے۔

"کہیے حضرت پولس لاک اپ میں کسی حرام زادے نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔ جمال خمار کو جانتے تھے خمار انہیں نہیں پہچانتے تھے۔ خمار نے انہیں اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کون سے لاک اپ کی بات کر رہے ہیں آپ؟ مجھے خمار بارہ بنکوی کہتے ہیں۔ میں مشاعرہ کے لئے حاضر ہوا ہوں ...... "میں جانتا ہوں قبلہ! میں اسی لاک اپ کی بات کر رہا ہوں جہاں کچھ دیر پہلے آپ کو بند کیا گیا تھا۔ میں آپ کو ہی چھڑانے کے لئے جا رہا تھا۔ اچھا ہوا"

خمار جمال کی بات سن کر زمین پر صندوق رکھ کر کھڑے ہو گئے ...... مجھے لگتا ہے آپ کو دماغ کے علاج کی ضرورت ہے۔ خمار کے طنزیہ تخاطب نے جمال کو ناراض کر دیا اور وہ جھلا کر کہنے لگے۔

"واہ صاحب واہ شراب آپ پئیں، بہکیں آپ اور دماغ کا علاج میں کراؤں۔ بزرگوار خیریت جانیے۔ آپ مہمان ہیں اگر کوئی اور اس طرح بات کرتا تو ایسی مرمت کرتا کہ ساری

شاعری وائری بھول جاتا آپ کیسے شاعر ہیں کس سے کیسی بات کرنی چاہیے یہ بھی آپ کونہیں معلوم۔میں یہاں ڈپٹی پولس کمشنر ہوں۔سمجھے''۔انہوں آوازاونچی کر کے اور آنکھیں نکال کر کہا۔

اب خمارؔ کے غصہ کی باری تھی۔انہوں نے اپنی مخصوص گالیوں کا اسٹاک نکالا اور ان پر برسانا شروع کردیا۔آپ مادر...... ہیں...... حرام کے...... ہیں بہن...... ہیں...... ڈپٹی کمشنر نے اب تک دوسروں کو گالیاں دی تھیں۔گالیاں کھائی نہیں تھیں اور وہ بھی خالص بارہ بنکوی۔انہیں شاید یہ بھی علم نہیں تھا کہ خمارؔ غزل کے مزاج داں ہی نہیں تھے گالیوں کے ملک کے حکمراں بھی تھے۔ جنہوں نے خمارؔ کو مشاعروں کے اسٹیج پر دیکھا تھا۔وہ جانتے تھے کہ وہ جس شاعر کے متوجہ کرنے پر اسے واہ اور سبحان اللہ سے نوازتے تھے۔اس کا چہرہ پھرتے ہی اس کی ماں بہن کا بکھان شروع کر دیتے تھے لیکن یہاں مشاعرہ کا اسٹیج نہیں تھا۔معاملہ آمنے سامنے کا تھا۔دیکھتے دیکھتے ہاتھا پائی شروع ہوگئی اور اس غیر متوقع مڈبھیڑ میں جمال ہی مصنوعی بتیسی کے سامنے کے تین دانت کے ساتھ خمارؔ صاحب کی شیروانی کے دو۲ بٹن بھی شہید ہوگئے تھے۔اس طریقہ سے احمد جمالؔ کی تو تکار تو مشاعرہ کے اختتام تک ضرور خاموش رہی لیکن اس میں خمارؔ کو جو پریشانی ہوئی اس کے لئے میں شرمندہ تھا۔خمار صاحبؔ کو اصل واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے پان سپاری اور تمباکو کے بٹوے سے کچھ اور بڑی چھوٹی گالیاں نکال کر جمال کی غیر حاضری میں اس کی نذر کردیں۔

خمار کے ساتھ میں نے کئی مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ٹرین میں بسوں میں' ہوائی جہازوں میں ان کے ساتھ سفر کیا تھا۔وہ گھریلو قسم کے شریف انسان تھے۔غزل کہنے اور سنانے کے علاوہ ادب سے انہیں کچھ لینا دینا نہیں تھا ان کی فرصتیں پہلے شراب اور بعد میں جب شراب ترک کردی رمی کے پتوں میں خرچ ہوتی تھیں۔

ان کے مزاج کی تعمیر میں محرم کی مجلسوں کی برکتیں' مزاروں کی زیارتیں' قصباتی فضیلتیں' جگرؔ مرادآبادی کی شفقتیں اور حسن کی چاہتیں شامل تھیں۔وہ شروع سے سلام و منقبت کے ماحول میں پلے بڑھے تھے۔اس تہذیب نے نہ صرف ان کے مزاج کو شائستہ کیا تھا' ان کے

شعری لب ولہجہ کو بھی کلاسکی وقار دیا تھا۔ وہ شوخ بے حجابی اور جذبہ واحساس کی بے نقابی جو مشاعروں میں رائج تھی، خمار کی غزلیں ان سے دور تھیں۔ اس احتیاط و توازن میں غزل کا وہی فکری رویہ جھلکتا تھا جو ان سے پہلے فراقؔ، حسرتؔ اور جگرؔ کے یہاں مہکتا تھا۔ خمارؔ نے اپنی غزل کو فراقؔ کی گہری سنجیدگی کی جگہ جگر و اصغر کے مجاز و حقیقت کے تصوف آمیز امتزاج کے قریب کیا تھا۔

محمد حیدر خاں خمارؔ لکھنؤ کے قریب بارہ بنکی میں ستمبر ۱۹۱۹ میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی کی درسی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ پھر انگریزی اسکول میں داخل ہوئے۔ میٹرک کے بعد کالج بھی گئے۔ لیکن ابھی انٹر میں ہی تھے کہ ایک پردہ نشیں نے کہیں سے سامنے آکر اس طرح نقاب اٹھائی اور اس ادا سے وہ بجلی لہرائی کہ آنکھوں کو کئی دنوں کتاب نظر نہیں آئی۔ اس رومانی حادثہ نے زندگی کو کالج کی پڑھائی سے دور کرکے آشنائی کے حوالے کر دیا۔ خمارؔ کی پہلی محبت بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں غزل میں محبوبہ کے بدلتے ہوئے کردار کی طرح درمیانی طبقہ کا ایک گھریلو وجود تھی۔ اس کی ایک جھلک انہوں نے اپنے ایک قطعہ میں پیش کی ہے۔ یہ وہی محبوبہ تھی جو حسرتؔ کے یہاں کوٹھے پر ننگے پاؤں آتی تھی اور جگرؔ کے یہاں پردے کے پیچھے آنسو بہاتی تھی۔

لبوں پر تبسم نگاہوں میں مستی
اداؤں کے جھرمٹ میں وہ آرہے ہیں
نظر لڑ گئی ہے جو میری نظر سے
پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں

ان کی اس پہلی محبت کا انجام بھی وہی ہوا جو عام طور سے ہوتا ہے۔ محبت میں جنون سے زیادہ اہمیت، ماں باپ کی نظروں میں اقتصادی تحفظ کی ہوتی ہے۔ مجازؔ کے بارے میں عصمت چغتائی نے ایک بار لکھا تھا۔ ”علی گڑھ میں لڑکیاں مجازؔ کا نام تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی تھیں یہ جاننے کے لئے کہ صبح مجاز کس کے نصیب کا ستارہ بنتے ہیں۔“

لیکن جب ان کے لئے رشتہ کی تلاش ہوئی تو کوئی پری چہرہ ان کی فال میں نہیں نکل

سکا۔ وجہ صاف تھی شاعر کے پاس صرف شاعری تھی' اور لڑکیوں کے والدین کو ان کے مستقبل سے وابستگی تھی۔ خمارؔ نے بھی اپنی اس رومانی ناکامی کا مرثیہ اپنے ایک گیت نما نظم میں تحریر کیا تھا جو بعد میں تھوڑی بہت ردو بدل کے بعد فلمی نغمہ بنا دیا گیا تھا۔ اس نظم کا ایک بند یوں ہے

چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا
روتے دھوتے ہی کٹے گی ہمیں معلوم نہ تھا
موت بھی ہم پہ ہنسے گی ہمیں معلوم نہ تھا
زندگی روگ بنے گی ہمیں معلوم نہ تھا

لیکن یہ زندگی بھر کا روگ وقت کے ساتھ نئے تنجوگ میں ڈھل گیا اور وہ کئی بچوں کے باپ بن کر زندگی کی گاڑی میں بیل کی طرح جت گئے ...... اور بیتی ہوئی یادوں کو مشاعروں کی شاعری بناتے رہے اور گھر چلاتے رہے۔

کبھی شعر و نغمہ بن کے کبھی آنسوؤں میں ڈھل کے
وہ ملے تو مجھ کو لیکن ملے صورتیں بدل کے
جب کبھی مجھ کو غم دہر نے ناشاد کیا
اے غم دوست تجھے میں نے بہت یاد کیا
پھیلتی جاتی ہیں ہر سو بھینی بھینی نکہتیں :
وہ خراماں کیا ہوئے گلشن خراماں ہو گیا
بھولے ہیں رفتہ رفتہ انہیں مدتوں میں ہم
قسطوں میں خودکشی کا مزہ ہم سے پوچھیے

عرب امیریٹ میں دبائی کے ہوٹل کازابلانکا میں خمارؔ صاحب اور میں ایک ہی کمرہ میں تھے۔ صبح کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ہونگے کہ کمرہ کی گھنٹی بجی اور ایک معمر خاتون لگ بھگ خمارؔ صاحب کی عمر کی بڑا سا گلدستہ لیے اندر داخل ہوئیں۔ وہ خمارؔ صاحب سے ملنے آئی تھیں۔ خمارؔ

آنکھوں پر چشمہ رکھ کر انہیں ابھی پہچاننے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ وہ بڑی بی بول پڑیں۔ میں جانتی تھی آپ کو میں یاد نہیں آؤنگی' یاد دلانا پڑے گا۔ اور پھر وہ یاد دلانے لگیں۔ اچھا یہ بتایئے جس قطعہ میں آخری مصرع ہے پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں" وہ کس کے بارے میں تھا۔ اتنا سنتے ہی خمارؔ صاحب کھڑے ہو گئے اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔ اور اس کے بعد پچاس پچپن سال پہلے کا بارہ بنکی وہاں کی گلیاں امام باڑے کی مجلیسیں کالج کی تا نک جھانک دور دور کی ملاقاتیں سب چند لمحوں میں کمرہ میں چاروں طرف بکھر گئیں۔ خمارؔ کا شعر ہے۔

کہانی میرے ہی گذرے ہوئے لمحات رنگیں کی
مجھی کو اب حدیث دیگراں معلوم ہوتی ہے

وہ محترمہ اپنی نواسی کے ساتھ آئی تھیں۔ خمار کے لیے کئی تحائف کے ساتھ۔ ان کے جانے کے بعد خمارؔ صاحب آپ ہی آپ بول رہے تھے بول کیا رہے تھے وقت کے جبر کو کوس رہے تھے۔

لعنت ہے صاحب' پچاس سال سے جو یادیں عزیز تھیں وہ اتنی ناچیز تھیں یہ آج معلوم ہوا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ یہ وہی صاحبہ ہیں جو میرے پہلے مجموعہ حدیث دیگراں کے کئی شعروں میں اب تک پوشیدہ تھیں۔ آج اچانک ظاہر ہوئیں تو سارا رومانس ختم ہو گیا وقت بھی زندگیوں کے ساتھ کیسا کیسا سلوک کرتا ہے"۔

یہ حقیقت ہے اردو شاعروں کی محبوبہ ہمیشہ سولہ سے پچیس کی عمروں میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ وہ کم سن ہو سکتی ہے جوان ہو سکتی ہے لیکن پختہ عمر کی کبھی نہیں ہوتی۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی ایک نظم میں اس غلطی کو سدھارنے کی کوشش کی تھی۔ جگرؔ نے بھی اپنی ہی طلاق شدہ بیوی نسیم سے جب اصغر کی وفات کے بعد دوبارہ شادی کی تھی تو ایک غزل میں مطلع کہا تھا

گداز عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا

خمارؔ کی حیات میں ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ پہلا مجموعہ حدیث

دیگراں تھا، جو کتب خانہ تاج ممبئی نے شائع کیا تھا۔ رقص مے اور آخری مجموعہ شب تاب ساقی بک ڈپو حیدرآباد سے چھپا تھا۔ ان مجموعوں میں شکیل بدایونی کے برعکس فلمی گیتوں کی شمولیت سے گریز کیا گیا تھا۔ شب تاب میں غزلوں کے ساتھ ایک سیکشن نعتیں اور سلام کا بھی ہے۔ خمار کی عقیدت کی شدت نے کتاب کے اس باب کو ادبی لحاظ سے زیادہ باوقعت اور پر تاثیر بنایا ہے انہوں نے سلام اور نعتیں مقابلتہً کم لکھی ہیں لیکن ان تخلیقات کو انہوں نے اپنی تہذیبی اقدار کا ترجمان بنایا ہے اور الفاظ میں نیا جادو جگایا ہے۔

میں نے جو چھیڑی نعت رسولؐ
چھا گئے بادل کھل گئے پھول
ہائے رے حسنِ عشقِ رسولؐ
شام کو تارا صبح کو پھول

سلام کے شعر ہیں

جب کبھی حق کی بات چلی
چھڑ گیا ذکر ابنِ علی
یہ ہے نبی کے گھر کا پتہ
موڑ ہیں بارہ ایک گلی
ہم بہک جانے پہ بھی بات ایک ہی کہنے لگے
یا محمدؐ کہتے کہتے یا علی کہنے لگے

ان نعتوں اور سلاموں میں ان کی غزل سے زیادہ تازہ کاری اور لفظوں کے برتاؤ میں زیادہ فنکاری نظر آتی ہے۔ ان میں وہی نرمیاں اور گرمیاں محسوس ہوتی ہیں جو نجم آفندی سے منسوب ہیں۔ حیدرآباد میں نجم آفندی کی طرح ایک زمانے میں خمار صاحب بھی معظم جاں کے دربار کی زینت تھے۔ خمار شاگرد تو اپنے چچا قرار بارہ بنکوی کے تھے۔ انہیں کے نام انہوں نے اپنی

پہلی کتاب حدیث دیگراں کا انتساب بھی کیا تھا۔ لیکن مزاجاً وہ جگرؔ کے حلقے کے شاعر تھے۔ جگرؔ بھی اپنے دور میں جن مترنم شاعروں کو اپنے قریب رکھتے تھے ان میں شکیلؔ، شعریؔ، رازؔ اور مجروحؔ کے ساتھ خمارؔ کا بھی نام تھا۔ خمارؔ اپنی شاعری میں ہی نہیں ترنم میں بھی جگرؔ کی پیروی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ مشاعرہ کے کامیاب شاعر تھے۔ انھوں نے جب سے شاعری شروع کی تھی تب سے انتقال تک وہ مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت اور اس کی ضرورت سمجھے جاتے تھے مشاعروں کا اتنا لمبا سفر ان کے کسی ہم عصر کو نصیب نہیں ہوا مختلف علاقوں میں ان کے جشن منائے گئے۔ جہاں جہاں اردو والے تھے۔ وہاں شعر خوانی کے لئے بلائے گئے۔ ہر جگہ تعریف و توصیف کے ہار پہنائے گئے۔ آخری دنوں میں قریبی رشتہ داروں کی مسلسل اموات سے ٹوٹ کر بھی وہ مشاعروں کے فعال کردار تھے۔ ان کی بہت سی غزلوں کو ہندو پاک کے مشہور موسیقاروں نے گایا ان کے کئی فلمی گانوں نے ان کے نام کو ملک کے کونے کونے تک پہونچایا مشاعروں کے ناظموں نے انہیں شہنشاہ غزل اور وقار غزل کے خطابات سے نوازا۔ اکیاسی ۸۱ برس کے غم و خوشی کی حصہ داری پوری کر کے وہ ۱۹۹۸ کے آخری مہینے سے بارہ بنکی کے ایک موروثی قبرستان میں اپنے شہر کی تہذیبی تاریخ کا نشان ہیں

صبر کرو کہ زندگی چند دنوں کی بات ہے
معرکۂ غم و خوشی چند دنوں کی بات ہے
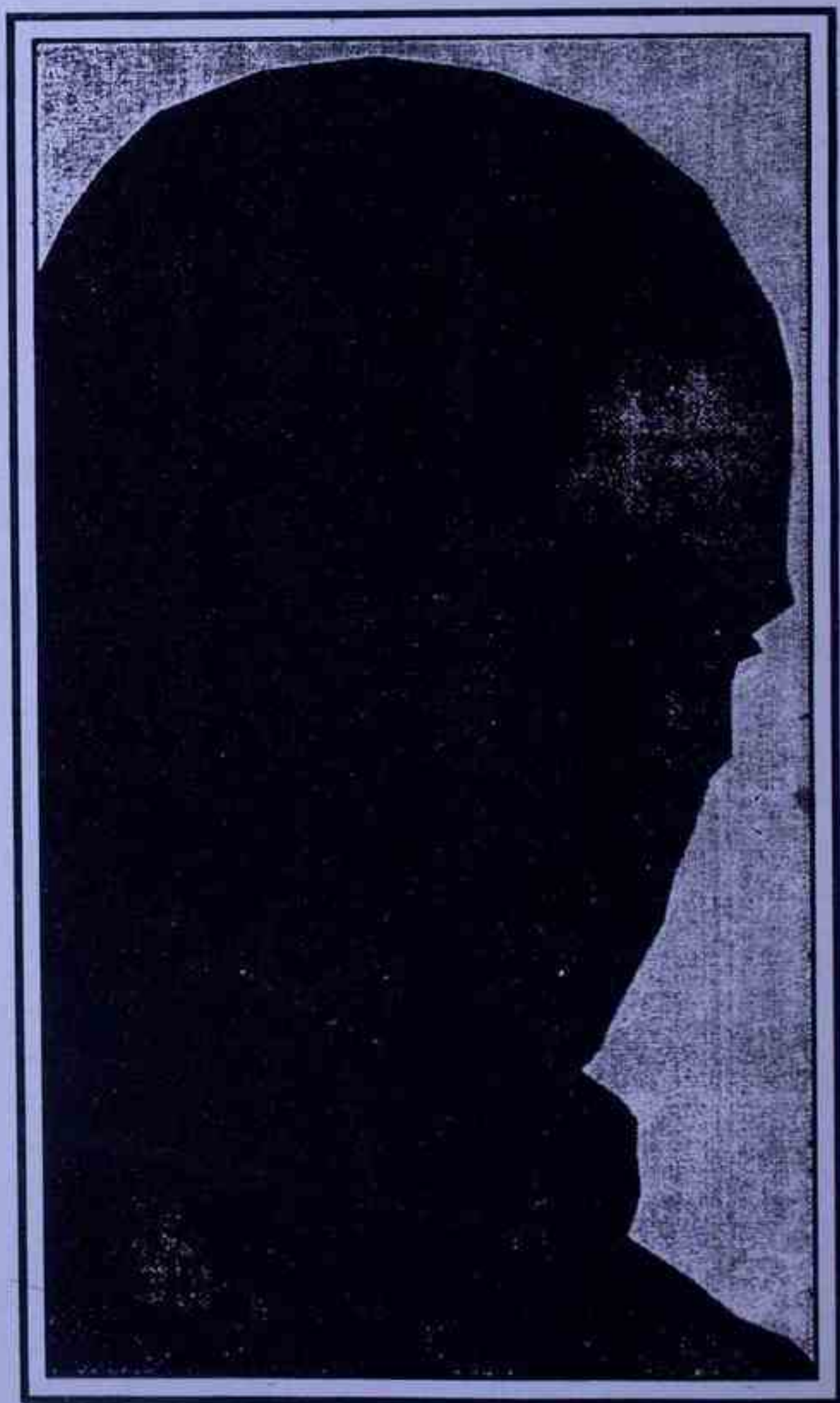
شفا گوالیاری

شفاگوالیاری

شفاؔ صاحب کا دواخانہ بھوپال میں 'اتوارے کے مشہور چوراہے کے دائیں جانب ایک چھوٹی سی دوکان میں تھا اس کے آگے کچھ فاصلے پر گرلس کالج تھا مہارانی لکشمی بائی۔ صبح سے شام تک لڑکیاں سامنے سے گذرتی تھیں راستے میں رنگوں کی طرح بکھرتی تھیں اور ادھیڑ عمروں کی شاعری میں نکھرتی تھیں۔

جبیں پہ بکھرے ہیں کچھ ستارے حسین رخ پر نکھار سا ہے
نہیں وجود بہار لیکن تمام عالم بہار سا ہے

اسعد بھوپالی

تیرا چہرہ صبح کا تارا لگتا ہے
صبح کا تارا کتنا پیارا لگتا ہے

کیف بھوپالی

یوں تو ان کی بزم میں جانے کو دنیا جائے ہے
اک مجھی کو دیکھ کر ماتھے پہ بل آجائے ہے

شفاگوالیاری

نظر غم آشنا دل وقفِ راحت لے کے آئے ہیں
تری محفل میں ہم آنکھوں میں جنّت لے کے آئے ہیں

وکیل بھوپالی

اس سڑک کے کنارے دواخانے میں شفا صاحب ڈاکٹر' کمپاونڈر اور مالک سبھی کچھ تھے۔ اس دواخانہ کے سامنے تھوڑی دور پر ایک ساتھ کئی تانگے کھڑے ہوتے تھے جن میں جُتے گھوڑے اپنی تھیلیوں میں منہ ڈالے گھاس کھاتے رہتے تھے۔ اور تانگے والے نیچے بیٹھے تاش کھیلتے تھے یہ شفا کلینک بے فکر شاعروں کا اڈا بھی تھا۔ ان کے اس کلینک میں مریض کم آتے تھے نئے پرانے شاعر اپنا کلام زیادہ سناتے تھے۔ اگر کسی کی غزل خوانی کے درمیان کوئی مریض بھی آجاتا تھا تو اس سے اشارے سے غزل کے ختم ہونے تک انتظار کرنے کو کہا جاتا تھا۔ یہاں اکثر ادیب وشاعر چائے پینے پان کھانے اور گپ شپ لڑانے بھی آتے تھے۔ جملے بازیاں اور غیبت سازیاں یہاں روز کا ماحول تھا۔ یہ مطب شہر بھر کی ادبی خبروں کا یہ ایسا اخبار تھا جو زبانی لکھا جاتا تھا اور کانوں سے سنا جاتا تھا یہاں سے خبریں نکل کر پورے شہر میں گشت کرتی تھیں۔

ایک بار کیفؔ بھوپالی اپنی ترنگ میں ادھر آ نکلے۔ شفاؔ صاحب کا نیا مجموعہ کلام حال ہی میں شائع ہوا تھا۔ کیفؔ کو دیکھ کر انہوں نے معائنہ کی میز پر لیٹے ہوئے مریض کو چھوڑ کر فوراً اپنی میز کی دراز سے نئے مجموعے کی ایک کاپی نکال کر انہیں پیش کی۔ اس مجموعہ کے پہلے ورق پر ان کی ایک تصویر تھی جس میں وہ اپنا ہاتھ بائیں گال پر ٹکائے مسکرا رہے تھے۔ شفا نے جب کیف سے اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی تو فوراً راضی ہو گئے اور جیب سے قلم نکال کر لکھنا شروع کر دیا۔ ان کا پہلا جملہ تھا۔

شفاؔ صاحب کے شعری مجموعے میں ان کی خوبصورت تصویر دیکھ کر مجھے ایک فلمی گیت یاد آتا ہے۔ 'ننھے منے بچے تیری مٹھی میں کیا ہے' ان کا تحریر کردہ اس شریر جملے کو پڑھ کر پاس بیٹھے ہوئے سارے احباب بلند آواز میں ہنسنے لگے۔ شفاؔ اس مذاق پر جھلا کر کہہ رہے تھے۔ ان کا تخاطب کیفؔ سے تھا۔

''محترم'' اس مٹھی میں بہت کچھ ہے۔ سیماب اکبرآبادی کی فارغ الاصلاح کی سند ہے۔ پچاس پچپن سال کی شعری مشاقی ہے۔ سینکڑوں ادبی رسائل میں کلام کی اشاعت ہے بے شمار کامیاب مشاعروں کی صدارت ہے' پانچ سو سے زیادہ شاگردوں کی تربیت ہے۔ مستند

استادوں کی صحبت ہے آپ گھر جا کر بھوپالی اور غیر بھوپالی کے تعصب سے آزاد ہو کر اس مٹھی کو کھولیے اور موتی رولیے۔ شاعری صرف ترنم نہیں ہے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے شعر گلے بازی سے نہیں نکلتے ان کے لئے فکر جذبہ اور ریاضت کی بھی ضرورت ہوتی ہے"

ماحول کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ شفاؔ صاحب کی تقریر نے دوسرے لوگوں کو بھی حیران کر دیا تھا۔ ان کے بگڑتے تیور دیکھ کر کیفؔ خاموشی سے اٹھ کر چل دیئے اور شفاؔ میز پر انتظار کرتے مریضوں کا پھر سے معائنہ کرنے لگے۔ وہ مریضوں کے نسخے بھی لکھتے جا رہے تھے اور اپنے شاگردوں سے گفتگو بھی فرما رہے تھے۔

"یہ مجھ سے جلتے ہیں اس لیے کہ میں گوالیار سے لٹ پٹ کے یہاں کیوں بسا ہوں؟ (شفا صاحب سن ۴۸ء میں سرکاری نوکری چھوڑ کر، گوالیار سے ہجرت کر کے یہاں آ کر بسے تھے) یہ مجھ سے ناراض ہیں اس لئے کہ میں بہت سوں سے اچھا کیوں کہتا ہوں؟ یہ مجھ سے حسد رکھتے ہیں اس لئے کہ میری شاعری کے مداح ملک کے مستند اشخاص کیوں ہیں یہ مجھے ناپسند کرتے ہیں، اس لیے کہ مجھے دور دراز کے مشاعروں میں کیوں مدعو کیا جاتا ہے؟ ان کے لیے میں صرف اپنا ہی شعر دہراؤں گا۔

بات جب ہے شاہکار زندگی بن کر رہے
آدمی جو ہر شناس آدمی بن کر رہے۔

جوہر شناسی کے لئے حوصلہ چاہیے جو ان میں نہیں ہے یہ لنگڑے نواب (حمید اللہ خاں) کی ریاست کے ہے یہاں کے لوگوں کی عقل کا لنگڑا ہونا ضروری ہے۔

شفاؔ صاحب سے ایسی چھیڑ خانیاں اکثر ہوتی رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ ان کی شہرت طلبی اور ضرورت سے زیادہ خود ستائشی تھی۔ شمع ادب لکھنو کے شفاؔ نمبر میں انہوں نے جو مختصر سوانحی خاکہ لکھا تھا اس میں اپنے بارے میں ان کی رائے کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ اپنے کلام کے تعلق سے بہت جذباتی تھے۔ ان کی دوستی دشمنی اسی سطح پر قائم ہوتی تھیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع ہمیشہ

شفا گوالیاری ہی ہوتا تھا۔ دوسروں سے اپنے بارے میں لکھوانا' ہر چھوٹے بڑے رسالے میں کلام چھپوانا' مشاعروں میں اپنے تن و توش سے دوگنی تگنی بلند آواز میں کلام سنانا دوسروں کی شاعری میں عروضی عیب گنوانا اور نئے نئے شاگرد بنانا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ شفا صاحب کے بیشتر شاگرد اپنے تخلص کے ساتھ شفائی لگاتے تھے۔ ایک عرصہ تک مشہور شاعر قتیل شفائی کو بھی لوگ انہیں کے شاگردوں میں شمار کرنے کی بھول کرتے تھے۔ جب قتیل کو اس بھول کا علم ہوا تو انہوں نے ایک رسالہ میں اس کی پر زور تردید کی۔

''لوگ غلط فہمی سے مجھے شفا گوالیاری سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ میرے ہم عصر اور غالباً ہم عمر ہیں۔ میرے استاد ہری پور ہزارہ کے ایک عالم شاعر تھے جن کا نام محمد یحیٰی اور تخلص شفا تھا ممکن ہے شفا گوالیاری بھی ان کی نسبت سے شفائی ہوں''۔ شفا نے اس تردید کو پڑھ کر کہا تھا

'یہ سچ ہے وہ میرے شاگرد نہیں ہیں۔ لیکن ان کے کلام کو دیکھ کر یہ ضرور محسوس ہوتا ہے انہیں کسی کامل استاد کی ضرورت ہے۔ اچھا ہوا انہوں نے خود صفائی پیش کر دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں خود اس کا اعلان کرنے والا تھا۔ کیونکہ فن شناس حضرات ان کے تخلص میں شفائی کے جڑے ہونے سے میری استادی پر شک کر رہے تھے۔ میں اس تردید کے لیے ان کا شکر گذار ہوں۔ ہم عمر اور ہم عصر ہونے کا مطلب ہم مرتبہ ہر گز نہیں ہوتا'۔

شفا اپنے دور کے مشہور شاعر تھے۔ ان کا شمار علامہ سیماب اکبر آبادی کے ممتاز شاگردوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں شاعری شروع کی اور ۱۹۴۰ء میں حلقۂ سیماب کے رکن بنے۔ لیکن اپنی ریاضت اور ذہانت سے پانچ سال کی مختصر سی مدت میں ہی فارغ الاصلاح ٹھہرائے گئے۔ ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد کو سراہتے ہوئے تلوک چند محروم نے شفا کے بارے میں لکھا تھا۔

''شفا صاحب'' نے فن کی باریکیوں کو آئندہ نسلوں تک محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہی کارنامہ آئندہ زمانوں تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ علامہ سیماب کے چراغ سے انہوں نے اپنا چراغ جلایا ہے ان کے شاگردوں نے ان کی روشنی سے اپنا راستہ سجایا

ہے

''سیماب اکبرآبادی نے ان کے بارے میں اپنی سند میں لکھا تھا۔'' شفا گوالیاری میرے عزیز شاگرد ہیں۔فن شاعری میں ان کی محنت اور ذہانت نے انہیں بہت جلد معتبر بنا دیا ہے ان کا کلام خوب ہے اور عیب سے پاک ہے۔''

دعا ڈبائیوی داغ اسکول کے استاد شاعر تھے شفا کے بارے میں ان کی رائے تھی شہرت و ناموری کے لحاظ سے گوالیار کا کوئی نیا یا پرانا شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔انہوں نے اپنی محنت اور فن سے اپنے آپ کو منوایا ہے۔

شفا صاحب بہت زود گو شاعر تھے۔انہوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کی حیات میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے تھے۔ان میں آیات شفا' نبض حیات' شاخ زیتون اور پرچم اردو اپنے زمانے میں خاصی مشہور کتابیں رہی تھیں ان پر اس زمانے میں کئی تبصرے شائع ہوئے تھے۔ان میں اکثریت ان کے شاگردوں کی تحریروں کی تھی۔پرچم اردو کئی صفحات پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جس میں نام بہ نام ان ادیبوں اور شاعروں کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا جن کی کاوشوں نے ان کی نظر میں اردو زبان کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ان میں ایک نام شکیل بدایونی کا بھی تھا۔جن کے مشاعرہ گروپ میں شفا کا نام بھی شامل تھا۔

شفا صاحب ترقی پسند تحریک میں تو شامل نہیں تھے' لیکن اپنے استاد بھائی نازش پرتاپ گڈھی فیاض گوالیاری اور اعجاز صدیقی کی طرح ان کی شاعری پر بھی ان تبدیلیوں کے اثرات نمایاں تھے جن سے کسی نہ کسی سطح پر یہ تحریک ہم رشتہ تھی۔ان کی شاعری بھی مزاجاً سماجی اور مقصدی رویہ کی حامی تھی۔سیماب کا شعری مزاج داغ کے برعکس زیادہ سماجی وتہذیبی تھا۔انہوں نے اپنے شعری رویہ کے بارے میں خود ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

''اوائل مشق سخن تک مجھے قدیم تغزل سے دلچسپی تھی۔لیکن زمانے کے ساتھ علم و معلومات کا دائرہ جس قدر وسیع ہوتا گیا۔رنگ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔اب شاعری میں فلسفہ

حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں ۔ میں اس شاعری کا منکر ہوں جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں ۔''

سیماب کی طرح سیماب کے شاگردوں نے بھی ادب میں مقصدیت کو اپنی منزل بنایا تھا ۔شفا کی شاعری کا مجموعی مزاج بھی افادی و سماجی ہے ۔ان کے یہاں افادیت 'شعریت کی قیمت پر اظہار کو سماجی و اصلاحی کردار عطا کرتی ہے ۔اس میں جذبہ و احساس کی کمی کو لفظوں کے برمحل استعمال' برجستگی کے جمال' اور فنی کمال سے پورا کیا گیا ہے ۔وہ علامات و استعارات کی پیچیدہ بیانی پر راست روانی کو ترجیح دیتے تھے ۔ان کی غزل ہو یا نظم تخلیق و قاری کے راست رشتے کا آئینہ دار ہے ۔

کوئی پھولوں سے سیکھے سرفراز زندگی ہونا
وہیں سے پھر مہکتے ہیں جہاں سے خاک ہوتے ہیں

گھسا ہر در پہ سر تو نے نہ پہچانا مقام اپنا
ارے بد بخت کرتا سب سے پہلے احترام اپنا

چمن کچھ اور بھی ہیں دشت و در کچھ اور بھی ہیں
رہ جنوں میں نقوش سفر کچھ اور بھی ہیں

مریض غم پہ توجہ کا شکریہ لیکن
فرائض نگہ چارہ گر کچھ اور بھی ہیں

نہ روک موج تبسم کو تیری محفل میں
فسردہ قلب ' تپیدہ جگر کچھ اور بھی ہیں

شفا نے کلاسکی شائستگی میں عصری سنجیدگی کی خارجی تابندگی کی شمولیت کو اپنا معیار بنایا تھا ۔اور اسی میں اپنی کتابوں اور مشاعروں میں اپنا کمال دکھایا تھا ۔وہ باہوش شاعر تھے ۔وہ دل سے زیادہ عقل کے فن کار تھے ۔وہ طبی پیشہ کی طرح اپنی شاعری میں بھی غیر جذباتی تھے انہیں اپنی شاعری سے اتنا پیار تھا کہ دوسروں کے کلام پر ان کی نظر مشکل سے پڑتی تھی ۔ان کی اس نرگسیت کا

لوگ باگ مذاق بھی اڑاتے تھے لیکن وہ اپنی سرشت سے مجبور تھے وہ جب تک جاگتے تھے۔ شعر سازی میں محو رہتے تھے۔ وہ چاہے کوئی بھی کام کر رہے ہوں۔ مریضوں کو دیکھ رہے ہوں یا شاگردوں کا کلام سن رہے ہوں ان کا اپنا کوئی شعر، رباعی، قطعہ یا نظم ان کے ذہن میں تعمیر ہو رہی ہوتی تھی۔ وہ مسلسل اور پابندی سے ہر روز کچھ نہ کچھ لکھنے والے شاعر تھے۔ ان کا سرمایہ جو ان کی کتابوں میں دستیاب ہے اس سے کہیں زیادہ اشاعت سے محروم ہے

شفا کے والد یوپی میں فرخ آباد کے مشہور حکیم تھے۔ وہ اپنے والد حکیم سید ادج علی کے ساتھ بچپن میں ہی سندھیار کی ریاست میں آئے تھے اور پھر یہیں اپنے ایک قریبی رشتہ دار کے ساتھ رہنے لگے۔ عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم مفتی شہر کے دینی مدرسہ میں حاصل کی اس کے بعد سرکاری اسکول میں داخلہ لیا لیکن حالات نے میٹرک سے آگے نہیں پڑھنے دیا۔ مجبوراً کمپاونڈری کا سرٹیفکٹ پاس کر کے ایک سرکاری ہسپتال میں ملازم ہو گئے۔ والد کی حکمت یونانی تھی بیٹے کی طبابت انگلستانی تھی۔ میرے بچپن کی یادوں میں شفا صاحب دو دوائیوں کے روپ میں محفوظ ہیں ایک کا نام کونین تھا جو بڑے سے کانچ کے جار میں بھرا ہوتا تھا اور دوسری سفید رنگ کے پاؤڈر کی صورت کی تھی جس کا نام اب میں بھول چکا ہوں ہر مرض کی دوا غریب نواز کی طرح ان کی دوائیاں بھی کافی مرض نواز تھیں ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کے پاس میں جب بھی جس مرض کو لے کر بھیجا جاتا تھا انہیں دو دوائیوں کو لے کر واپس آتا تھا۔ والد کے دوست ہونے کے ناتے وہ ہمارے فیملی ڈاکٹر بھی تھے۔ یہ دوائیاں ضرورت سے زیادہ کڑوی ہوتی تھیں شاید اسی تلخی سے ڈر کر مرض بدن چھوڑ کر بھاگ جاتا تھا۔ جب وہ سن ۱۹۴۷ء میں گوالیار چھوڑ کر بھوپال میں پناہ گزیں ہوئے تب بھی ان کے علاج کا یہی طریقہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا پہلے وہ خود میٹھے تھے، دوائیاں کڑوی تھیں لیکن اب دوائیوں کے ساتھ وہ بھی تلخ ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ مقامی شعراء کا وہ رویہ تھا۔ جسے وہ حاسدانہ سازشوں کا نام دیتے تھے۔ یہاں ایک طرف وہ اور ان کے شاگرد تھے اور دوسری طرف ان کے مقابلہ میں پورا بھوپال تھا۔ لیکن تاحیات وہ حادثوں سے ٹکراتے رہے شہرتیں کماتے رہے

مسلسل شعر گوئی سے حریفوں کو نیچا دکھاتے رہے اور انہیں کے ساتھ دو بیویوں اور کئی بچوں کی رات دن کی الجھنوں کو بھی سلجھاتے رہے

ہمارا پوچھنا کیا ہم وہ جاں باز محبت ہیں
ہماری موت میں بھی اک ادائے زندگی ہوگی

شفاؔ صاحب کافی ملنسار اور وضعدار انسان تھے۔ ان کا زیادہ وقت خط و کتابت' شعری ریاضت مشاعروں میں شرکت' یا شاگردوں کی غزلوں پر محنت میں گذرتا تھا۔ ان کے شاگردوں میں عشرت قادریؔ واحد پریمی، وفا صدیقی اور بہت سے دوسرے آج کے بھوپال کے ممتاز شاعر ہیں۔
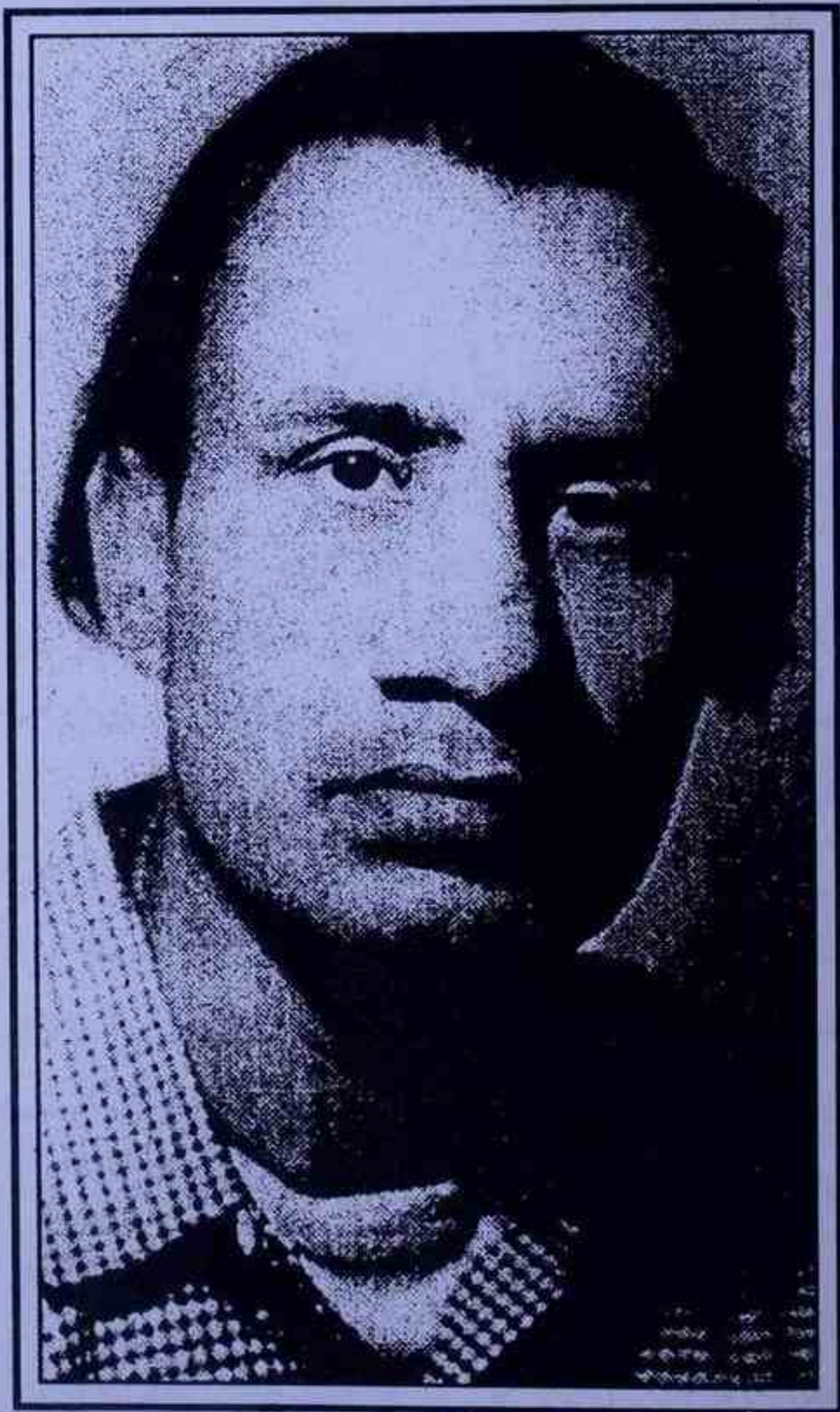
نریش کمار شاد

نریش کمار شادؔ

نریش کمار شادؔ سے میں کئی بار ملا ہوں۔ مشاعروں کے اسٹیج پر دہلی کے کافی ہاؤس میں ممبئی کے راستوں پر الگ الگ شہروں کی محفلوں میں۔ لیکن وہ جب بھی' جہاں بھی ملے' کبھی پورے نہیں ملے۔ ہمیشہ ایک چوتھائی یا آدھے یا دو تہائی ہی نظر آئے۔ صبح ہو یا شام وہ ہر وقت محوِ جام ہی ملے۔ وہ جتنے باہر ہوتے تھے اس سے کہیں زیادہ شراب میں چھپے ہوتے تھے۔

اسٹیج پر ہوتے ہوئے بھی وہ اسٹیج سے دور ہوتے تھے۔ وہ سب میں بیٹھے ہوئے بھی سب سے جدا ہوتے تھے۔ موٹر یا اسکوٹر کی مانند ان کے جسم کا انجن بھی بغیر الکوہل کے اسٹارٹ نہیں ہوتا تھا۔ شراب جو پہلے کبھی کبھی کا قصہ تھی۔ اب ان کی شخصیت کا لازمی حصہ تھی۔ اس شراب نے انہیں شہرت بھی بہت دی اور زحمت بھی بہت دی۔ شہرت اس طرح کہ ادبی گپ شپ میں ان کا نام بھی اختر شیرانی' میرا جی' جگر مرادآبادی عدم یا مجازؔ کی بلانوشی کے سلسلے میں لیا جاتا تھا۔ اس کی زحمت کے ذیل میں ان کی ہڈیوں کے کئی فریکچرس' فالج اور دوسری بیماریاں ہاتھا پائیاں اور کئی ملازمتوں سے علحدگیاں آتی تھیں۔ وہ جب تک حیات رہے کسی نہ کسی خبر کے ساتھ رہے۔

وہ اچھے شاعر تھے۔ نثر میں بھی رواں تھے۔ مسلسل لکھتے رہتے تھے۔ ہندو پاک کے رسائل میں شائع بھی ہوتے تھے۔ لیکن مجازؔ کی طرح ان کے ادب سے زیادہ ان کی شخصیت کا افسانہ مشہور ہوا۔ مجازؔ کا افسانہ دلچسپ تھا' کیونکہ اس افسانہ طرازی کو عصمت چغتائی' سردار جعفری'

کرشن چندر جیسے قلم کار ملے تھے۔ نریش کمار شاد اپنے افسانہ کے خود افسانہ نگار تھے۔ شاید اسی لئے ان کی بے اعتدالیوں میں تخیلی شوخیوں کی کمی تھی۔ ذہانت' وراثت یا قدرت کی دین ہوتی ہے۔ لیکن اس کو سنوارنے سجانے کے لیے جس محنت اور فراغت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی مہلت نریش کمار شاد نے اپنے آپ کو نہیں دی۔ اس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ انہوں نے اپنی سوانح میں ایک جگہ لکھا ہے۔

''شاد کی عادات کا ذکر اس کی شراب نوشی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہونگا کہ اس کی تمام مذموم عادتوں کا سرچشمہ ہی شراب ہے۔ شروع شروع میں وہ تفریحاً پیا کرتا تھا لیکن اب تو یہ لعنت رات دن کی مصیبت بن گئی ہے'' ان کے اشعار ہیں۔

گھیر لے غم اگر زمانہ کا
ڈھونڈ رستہ شراب خانہ کا

جام و مینا ہے کیف و مستی ہے
واہ کیا جشن تنگدستی ہے

تکلف بر طرف اے دوستوں جب جام آتا ہے
نہ توبہ کام آتی ہے نہ تقویٰ کام آتا ہے

تیرگی ہو کہ نور پیتے ہیں
پینے والے ضرور پیتے ہیں

شاد غیر منقسم ہندوستان کے پنجاب میں پیدا ہوئے۔ شاعری کے ساتھ شراب بھی انہیں وراثۃ میں ملی۔ لیکن شاعری اور شراب کے ساتھ کتاب نہ ان کے والد کی ضرورت تھی نہ ان کی وراثت میں شامل تھی۔ آدمی ذہین تھے ماحول ادبی تھا۔ ابتداء میں تعلیم کی کمی کو ادبی صحبتوں اور ذہانت کی برکتوں سے پورا کیا۔ شاد اپنی ادھوری تعلیم پر افسوس بھی کرتے تھے' لیکن اس افسوس کا تدارک کرنے کے بجائے انہوں نے اس کا ایک آسان نفسیاتی جواز تلاش کرلیا تھا۔ ان کا کہنا

تھا کہ ''نریش کمار جو ایک سیدھا سادھا معقول طالب علم تھا۔ ابھی وہ ساتویں کلاس میں پہونچا تھا کہ اسے شاد نے گھیر لیا۔''

نریش کمار اپنی ساری الجھنوں کا ذمہ دار اسی شاد کو ٹھہراتے تھے۔ اور اسی کو کوستے ہوئے مسلسل پیئے جاتے تھے۔ فرائڈ کے دوہری شخصیت کے اصول نے بہت سے دانشوروں کو گمراہ کیا ہے۔ جدید شاعری میں بھی یہ اندر باہر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اور اب تو یہ کلیشیز کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ شاد کے شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہوش میں شاد جب تجھے پایا
تجھ میں ہم نے تری کمی پائی

جب بے خودی سے ہوش کا یارانہ ہو گیا
دیر وحرم کا نام بھی میخانہ ہوگیا

شاد دو چار سال کے فرق کے ساتھ 'ساحر' کیفی' مجروح' سلام مچھلی شہری کے ہم عصروں میں تھے۔ لیکن ان ہم عصروں کی طرح ان پر کسی تحریک کے ڈسپلن کا دباؤ نہیں تھا۔ حالات اور وقت کی تبدیلیوں سے بھی شاد نے اپنے لفظوں کو روشناس نہیں کرایا تھا۔ انہوں نے ماضی قریب کے ورثہ سے جو پایا تھا اس کو ہی تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ بار بار دہرایا تھا۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ عاشقانہ سرمستی' رندی دمے پرستی یا مانوس شعری زبان میں زندگی کی رائج شباہتوں کا بیان ہے۔ کہیں کہیں اس پر ہم عصر شعراء کی پرچھائیاں بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس میں فکری گہرائی' اور فرد اور سماج کے رشتے کی پیچیدگی تو کم ہے مگر استادانہ برجستگی' زبان کی ڈرامائی شائستگی نے اس میں تابندگی پیدا کی ہے۔ ان کے لہجہ میں ایک بے باک کھلاپن اور تیکھا تیز چلبلاپن متوجہ کرتا ہے۔ ان کے مصرعوں کی روانی میں اساتذہ کی خوش بیانی کا رچاؤ ہے۔ داغ اسکول کا لسانی گٹھاؤ ہے۔ شاد مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ وہ تحت میں پڑھتے تھے۔ تیکھی کراری آواز اور ہاتھ پاؤں کے چلانے کے انداز کے ساتھ جملے بازیاں اور چٹکلے بھی ان کی شعر خوانی میں شامل رہتے تھے۔ وہ

خود تماشہ بن کر سامعین کو تماشہ بناتے تھے اور جب تک مائک کے سامنے رہتے تھے۔ چہرے بنا بنا کر شعر کی ادائیگی میں پنجابی کے ٹکڑے لگا لگا کر داد پاتے تھے۔ سامعین ان کی ہر غیر واجب ادا پر تالیاں بجاتے تھے۔ ان کے بعد مشاعرہ کی فضا کچھ ایسی ہو جاتی تھی کہ اس میں پھر سوائے مزاحیہ شاعر کے کسی اور کا پڑھنا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کلام سناتے ہی نہیں تھے' اسے دکھاتے بھی تھے۔

مشاعرے شاعر کو جہاں بگاڑتے ہیں وہاں سنوارتے بھی ہیں۔ سامعین کی سماعتیں لب و لہجہ کی ہکلاہٹیں ہی درست نہیں کرتیں' سست مصرعوں کو چست کرنے کے آداب بھی سکھاتی ہیں'' داغ' جلیل' نوح' بے خود' ناطق' ریاض' مضطر وغیرہ کی شاعری میں زبان کی ڈرامائیت قافیوں کی کھنک ردیفوں کی چمک سامع اور شاعر کے زندہ رشتوں کا ثبوت ہیں۔ لیکن جو شعراء اپنے اعتماد کو کھو کر صرف مشاعروں کی تالیوں تک محدود ہو جاتے ہیں وہ ادب میں مشاعروں کے بعد لاموجود ہو جاتے ہیں۔ نریش کمار شاد نے مشاعروں کا منفی اثر قبول کیا اور کہی کہائی باتوں کو اپنے الفاظ میں بار بار دہراتے رہے اور یوں اپنی ذہانت کو گنواتے رہے۔ شاد اپنے ہم عمروں میں ساحر اور سینیر شاعروں میں عدم سے بہت متاثر تھے۔ وہ عدم کے عقیدت مندوں میں بھی تھے۔ ان کی یہ عقیدت معتقدانہ بھی تھی اور جارحانہ بھی تھی۔

ایک بار جب عدم لاہور سے دہلی کے مشاعرہ میں آئے تھے تو ان کے رخصت ہو جانے تک جو رات دن سائے کی طرح ان کے ساتھ تھے وہ نریش کمار شاد ہی تھے۔ عدم ہندوستان جب آئے تھے تب بھی مدہوش تھے۔ جب یہاں سے واپس ہوئے تب بھی بے ہوش تھے۔ لاہور پہونچ کر جب ہوش میں آئے تو انہوں نے اپنی بیاضوں کا شمار کیا ان میں ایک کم تھی۔ اس ''ایک کم والی'' بیاض میں ان کے تازہ قطعات تھے۔ عدم کے یہ کھوئے ہوئے قطعات کئی مہینوں کے بعد انہیں کے کہنے کے مطابق انہیں لاہور کی ایک دوکان میں کتابی صورت میں ملے۔ لیکن اس کتاب پر شاعر کا نام نریش کمار شاد لکھا تھا اس بات میں کتنی صداقت ہے یہ تو تحقیق

طلب ہے لیکن دونوں کے کلام میں جہاں تک قطعات کا سوال ہے اتنی مماثلت تھی کہ کہاں سے عدمؔ شروع ہوتے تھے کہاں سے شادؔ ابتدا کرتے تھے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ یہ بھی ممکن ہے یہ بات عدمؔ کے کسی نشہ کی چہل ہو۔ عدمؔ کی طرح شادؔ بھی بہت زود گو تھے۔ شادؔ کئی شعری مجموعوں کے خالق تھے۔ لیکن ان کے مجموعے نام سے ہی الگ الگ ہوتے تھے کلام سے یکساں ہوتے تھے۔ ان کا کوئی بھی ایک مجموعہ پڑھ کر سب کے بارے میں رائے دی جا سکتی ہے۔

ایک مشاعرہ میں شادؔ کو جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا' اس میں ان کے ساتھ جھانسی کے ایک مترنم شاعر تاباںؔ جھانوی بھی تھے۔ دونوں ہم مزاج اور ہم پیالہ تھے۔ دونوں مشاعرہ میں اپنی کامیابیوں کے نشے میں سرشار تھے۔ اس سرشاری کو اور گہرہ کرنے کے لئے دونوں رات کو دیر تک جاگتے رہے ایک دوسرے کی عظمت کے قصیدے سناتے رہے۔ لیکن جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا شادؔ کمرہ کے ڈبل بیڈ پر اکیلے آرام فرما رہے تھے۔ اور تاباںؔ جھانوی زینہ کے پاس سمٹے سکڑے رات کی کہانی سنا رہے تھے۔

''ہوائیوں میں اپنے بستر پر سو رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا شادؔ ہاتھ میں چھری کانٹا لئے مجھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور جیسا سو رہا تھا ویسے ہی دروازہ کھول کے باہر نکل آیا۔ میں نے طے کیا ہے آئندہ سے اس کے ساتھ کبھی نہیں لڑونگا۔ وہ تو بڑا خطرناک آدمی ہے صاحب وہ ملکی تقسیم کا بدلہ مجھ سے لینا چاہتا تھا۔ بھلا سوچیئے بٹوارے کا ذمہ دار میں کیسے ہو سکتا ہوں۔ مگر وہ......''

خدا جانے تاباںؔ کی کہانی میں کتنی صداقت تھی۔ اس حادثہ کے بارے میں شادؔ نے جو بیان دیا وہ یوں تھا

''میں آرام سے سو رہا تھا کہ تاباںؔ کے غیر شاعرانہ خراٹوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرے ٹوکنے پر وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔ مگر وہ اکیلا نہیں گیا میری بوتل بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ باہر پیتا رہا اور میں اندر ترستا رہا۔ وہ تو بہت برا آدمی ہے صاحب میں

نے طے کیا ہے آئندہ کبھی اس کے ساتھ نہیں ٹہر

ونگا بات بھی نہیں کرونگا۔

دونوں نے جو تھوڑی دیر پہلے طے کیا تھا' وہ نہا دھو کر بھول چکے تھے اور ساتھ ساتھ پھر سے پی رہے تھے۔

شاؔد نے شاعری پہلے شروع کی روزگار کی تلاش بعد میں کی۔ پہلی ملازمت راول پنڈی کے ایک سرکاری دفتر میں کی۔ آفس وہ کبھی اکیلے نہیں جاتے تھے، اپنی شراب کو بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ جب ایک کرسی پر دو کی گنجائش پیدا نہیں ہو سکی تو وہ کسی زیادہ کشادہ کرسی کی تلاش میں استعفی دے کر باہر آ گئے۔ بے روزگاری کا ایک طویل عرصہ گذارنے کے بعد جب ایک بڑا افسران پر ان کی شاعری کی وجہ سے مہربان ہونے والا تھا۔ تو ملکی تقسیم آڑے آ گئی۔ اور وہ گھر سے بے گھر ہو کر دہلی آ گئے۔ یہاں بھی شاعری کی شہرت ہی ان کے کام آئی۔ وہ ایک دفتر میں نام چار کے کلرک ہو گئے۔ اس کلرکی میں ان کا کام صرف اتنا تھا کہ روز آفس ٹائم پر آ کر رجسٹر میں دستخط کر جائیں اور دن بھر جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ یہ تھوڑا سا کام بھی ان کے شاعرانہ مزاج پر بار تھا۔ وہ گھر سے تو آفس کے لئے نکلتے تھے' مگر آفس کبھی کبھار ہی پہونچ پاتے تھے۔ دہلی میں ان کی شناسائیوں کا دائرہ کافی وسیع تھا۔ اس میں تانگے والے اور رکشا ڈرائیور سے لے کر کالج کے طلباء تک شامل تھے۔ کہیں بھی کوئی انہیں روک لیتا تھا اور یہ سب کچھ بھول کر وہیں کے ہو جاتے تھے۔ اتنی لاپرواہی کے باوجود ان کی ملازمت ہر مہینہ ان کی پوری تنخواہ ان کے گھر پہونچا دیتی تھی۔ شاؔد مشاعروں کے علاوہ بھی شعر سناتے تھے۔ سڑکوں پر چوراہوں پر فٹ پاتوں پر۔

شاؔد اکیلے نہیں تھے۔ وہ ایک بھرے پرے گھر کے فرد تھے۔ ان کے گھر میں ایک بوڑھی ماں' بیوی اور بچے تھے۔ گھر کی بڑھتی ذمہ داریوں نے آخری دنوں میں انہیں شراب سے دور بھی کر دیا تھا۔ اس شعوری دوری نے ان کی قلم کو کافی تیز رفتار کر دیا تھا۔ وہ شمع اور بیسوی صدی میں شاعروں اور ادیبوں کے لطیفے اور ان کے انٹرویوز لکھتے تھے۔ مختلف رسالوں میں فرمائشوں پر غزلیں کہہ کر چھپواتے تھے' کھاتے پیتے شوقیہ شاعروں کو اجرتاً کلام بھی عنایت فرماتے تھے۔ ان

دنوں ان کی نثر ونظم کی کئی کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ نظم کی طرح ان کی نثر کی زبان بھی شگفتہ ورروان تھی لیکن شراب سے ان کی یہ دوری زیادہ دیر تک ان کے ساتھ نہیں چل سکی۔ شراب کو انہوں نے یک لخت چھوڑنے کی کوشش کی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ایک ساتھ کئی بیماریوں کا شکار ہونے لگے تھے۔ ان بیماریوں سے لڑنے کے لئے ان کے پاس نہ سرمایہ تھا نہ عمر تھی۔ مجبوراً وہ پھر سے ویسے ہی ہو گئے جیسے پہلے تھے۔

شاؔد ایک رومانی مزاج کے انساں تھے۔ ان کے مزاج اور زمانے کے انداز میں مطابقت ممکن نہیں تھی۔ لیکن یہ عدم مطابقت جوان کی شخصیت کا تضاد تھا۔ ان کی شاعری میں کم کم دکھائی دیتا ہے۔ ان کی زندگی شاعرانہ ضرور تھی لیکن ان کی شاعری اس زندگی سے کافی دور تھی۔

ان کا ایک قطعہ ہے

شبنمی پیرہن میں رہ رہ کر
یوں ترا روپ مسکراتا ہے
جیسے جمنا کی نرم لہروں میں
چاند کا عکس جھلملاتا ہے

نریش کمار شاد کو شبنمی پیرہن میں مسکراتا ہوا یہ روپ ایک بار نشے میں دہلی میں جمنا کے کنارے لے گیا۔ اس روپ کے تعاقب میں وہ جمنا کی لہروں میں اتر گئے۔ اور جمنا نے ہمیشہ کے لئے ان کی بے سکون روح کو پر سکون کر دیا۔

یوں آئے وہ رات ڈھلے
جیسے جل میں جوت جلے

تاج بھوپالی

محمد علی تاج

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اچھے شعروں کو کسی تنقیدی بیساکھی یا گروہی سفارش کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کتابوں یا مشاعروں سے اشعار خود باہر نکل آتے تھے، اور اپنے پیروں سے ہر جگہ پہونچ جاتے تھے۔ شکیب جلالی، پاکستان کے پنجاب کے کسی رسالہ میں غزل چھپواتے تھے، اور ان کے شعر کناٹ پیلیس دہلی کے کافی ہاؤس میں دہرائے جاتے تھے۔ شاذ تمکنت حیدر آباد کی کسی ہوٹل میں کسی کو غزل سناتے تھے اور شعر ایک ساتھ بھوپال لکھنؤ دہلی اور گوالیار کی شاموں میں جگمگاتے تھے۔ تنقید میں پیری مریدی کی روایت بہت بعد کی بات ہے۔

آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے
شکیب جلالی

میرا ضمیر بہت ہے مری سزا کے لیے
تو دوست ہے تو نصیحت نہ کر خدا کے لیے
شاذ تمکنت

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانہ میں شہادت کے یہی اسباب تھے
حسن نعیم

ایک پل کے رکنے سے دور ہو گئی منزل
صرف ہم نہیں چلتے راستے بھی چلتے ہیں
شاہد صدیقی

یہ اور ایسے ہی بہت سے اشعار کبھی شاعر کے نام کے ساتھ اور کبھی بنا نام کے محفلوں میں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے، گلی کوچوں میں سنائی دیتے تھے جہاں جائیے ایسے ہی شعروں کی گونج سنائی دیتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برے اشعار کو اچھا ثابت کرنے اور اچھے شعروں کو در گذر کرنے کا تنقیدی رجحان نہیں پنپا تھا...... عادل منصوری کی معمہ سازیوں اور ظفر اقبال کی پینترا بازیوں کو ادبی اعتبار حاصل نہیں ہوا تھا۔ شعروں سے غنائیت اور جذبہ و احساس کی حرارت غائب نہیں ہوئی تھی۔ قاری و تخلیق کا رشتہ کسی نہ کسی سطح پر برقرار تھا۔

محمد علی تاج سے ملنے سے پہلے ان کے کچھ شعر کسی مشاعرہ سے چل کر مجھ سے میرے شہر گوالیار میں ملنے آ چکے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا یہ اعزاز مجھ تک ہی محدود نہیں تھا۔ وہ دور پاس کے دیگر علاقوں میں بھی بہت سوں سے ملاقات کر چکے تھے۔ کئی ہوٹلوں میں کافی ہاؤسوں میں بہت سوں سے بات کر چکے تھے۔ انہیں گھومنے پھرنے کے لئے بیرونی حوالوں سے بوجھل تنقید کی بیساکھیوں کی ضرورت نہیں تھی۔

حرم و دیر کے منظر نہیں دیکھے جاتے
دیکھنے والوں سے پتھر نہیں دیکھے جاتے
یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی
ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے
پیچھے بندھے ہیں ہاتھ مگر شرط ہے سفر
کس سے کہیں کہ پاؤں کے کانٹے نکال دے

تاج کے شجرہ سے میں واقف نہیں ہوں۔ پتہ نہیں وہ خاص بھوپال کے تھے یا ان کے

اجداد کہیں سے آ کر یہاں بسے تھے لیکن وہ اپنی چال ڈھال اور چہرے سے ایک ساتھ کئی علاقوں کے باشندے لگتے تھے۔ پان میں چھالیوں کی بھرمار اور چنگی دار چونے کے اعتبار سے بھوپالی رنگت کی سیاہی کے لحاظ سے بنگالی کوتاہ قدی سے گڑھوالی اور اندر اتری ہوئی چھوٹی آنکھوں اور چپٹی ناک سے ان پر نیپالی ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن انہیں پہلی بار دیکھنے پر یہ میرا تاثر تھا۔ جو ان کو ہر روز بار بار دیکھتے تھے ان کے لئے وہ بھوپالی تھے۔ صرف بھوپالی

تاج کو بھوپال سے بہت پیار تھا اور بھوپال بھی دل و جان سے ان پر نثار تھا۔ وہ شہر میں کسی بھی وقت کسی بھی گھر پر دستک دے کر اندر جا سکتے تھے۔ اور بلا تکلف بزرگ ہوں یا جوان ان کے ساتھ وقت بتا سکتے تھے۔ شعری بھوپالی اور کیف بھوپالی بھوپال سے باہر بھلے ہی ان سے زیادہ مشہور رہے ہوں لیکن بھوپال میں تاج کی شہرت کی برابری بھوپال تال کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ حفیظ کے جالندھر، جگر کے مراد آباد فراق کے گورکھپور مخدوم کے حیدر آباد کی طرح بھوپال بھی تاج کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بھوپال میں ان کی مقبولیت تانگے والوں اور بھکاریوں سے کابینہ کے وزیروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ بھوپال میں ایک گلی نما لمبا سا بازار ہے۔ اس کا نام ابراہیم پرا ہے۔ اس میں پہلے درمیان میں ایک ہوٹل تھی۔ اس ہوٹل کا مالک تو کوئی اور تھا لیکن مینیجر اور خان ساماں دونوں تاج تھے۔ اس میں ہر وقت ادیبوں، شاعروں اور سیاست دانوں کا جماؤ رہتا تھا۔ جب گراہکوں کی وجہ سے جگہ تنگ ہو جاتی تھی تو سیاست کی گرما گرم بحثیں، شاعری اور اس کی ترقی پسندانہ تنقیدیں ہوٹل سے اٹھ کر باہر سڑک کنارے بچھے لکڑی کے تختوں پر براجمان ہو جاتی تھیں۔ ان سیاسی اور ادبی مباحثوں کو جاری رکھنے کے لئے تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے آتی رہتی تھی، جو تاج کی طرف سے مفت تقسیم ہوتی تھی۔ تاج کبھی کاؤنٹر سے اٹھ کے اور کبھی بڑی سی کڑھائی میں سموسوں کا مسالہ چھوڑ کر، وقفہ وقفہ سے ان میں شرکت کرتے تھے۔ باہر سے آئے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی خاطر مدارات کا ذمہ بھی اسی ہوٹل کے سر تھا۔ ہوٹل اچھی تھی چلتی بھی خوب تھی۔ مگر تاج کی مسلسل ادب نوازی نے اس کے فائدہ کو خسارے کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ جس کی وجہ

سے وہ چلتے چلتے اچانک ایک دن بند ہوگئی۔ اور پھر کامریڈ شاکر علی خاں، متھرا بابو، باسط بھوپالی، ارشد صدیقی، عشرت قادری اور دوسرے مقامی اور بیرونی ادیب وشاعر الگ الگ کئی جگہ بیٹھنے لگے بھوپال میں سب سے اونچے قد کے حکیم شمیم کامریڈ گھڑ ومیاں کی ٹیلرنگ کی دوکان میں، جو خود بھی مزاحیہ شاعر تھے متھرا بابو کے کتابوں کے شوروم میں جہاں کتابیں کم بکتی تھیں کتابوں کو دیکھنے والے اپنے اشعار زیادہ سناتے تھے یا اور کہیں۔

تاج سیدھے سادے شاعر مزاج آدمی تھے۔ اردو فارسی کی ابتدائی درسی کتابوں سے آگے نہ وہ بڑھ پائے تھے نہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی شاعری کا شوق شروع سے تھا۔ خداداد صلاحیت، شاعروں اور دانشوروں کی صحبت اور اشتراکیت سے گہری عقیدت کے سہارے شعر کہتے تھے۔ اور اپنی مستی میں مگن رہتے تھے۔ دو مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا ان کی حیات میں خیمہ گل کے نام سے دوسرا وفات کے بعد مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے چھاپا۔ پہلے مجموعے میں دیباچہ جاں نثار نے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے تاج کی شعری ذہانت کو سراہتے ہوا ایک جگہ لکھا تھا۔

''تاج جو اپنے شہر بلکہ اپنے صوبہ کا سب سے مقبول اور ہر دل عزیز شاعر ہے کل ہندوستان گیر شہرت کا مالک بنے گا۔ یہ میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے۔''

جاں نثار کی اس سوچی سمجھی رائے نے ان دنوں ملک کے کئی دانشوروں کو متوجہ کیا تھا۔ ان میں سجاد ظہیر، احتشام حسین اور سردار جعفری کے توصیفی تبصرے خاص تھے۔ تاج کے اس پہلے مجموعے کو ایڈٹ بھی جاں نثار نے ہی کیا تھا اور بہت سارے میں سے بہت تھوڑے ہی کو قابل اشاعت سمجھا تھا۔

دوسرا مجموعہ سورج نما کے نام سے جدید شاعر فضل تابش نے ترتیب دیا تھا۔ تاج بیاض رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کا کلام ان کے مداحوں کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ یا گھر میں سگریٹ کی ڈبیوں کے کور پر ماچس کی ڈبیوں پر یا بے ترتیب کاغذ کے پرزوں میں بکھرا ہوا تھا۔ تاج چلتے

پھرتے شعر کہتے تھے ان کی کوئی غزل تین یا چار شعر سے آگے نہیں بڑھتی تھی ۔ وہ خود اپنے کلام کے ناقد تھے۔ اتنے ہی شعر کہتے تھے جتنے ان کے معیار پر پورے اترتے تھے جب شعر ہو جاتے تھے تو وہ ہر کس و ناکس کو سنائے جاتے تھے۔ فضل تابش نے جو مجموعہ شائع کیا وہ تاج کے مداحوں کی یادداشتوں سے اخذ کیا تھا۔ یا گھر کی چھان بین سے حاصل کیا تھا۔

احد ہوٹل کے بند ہو جانے کے بعد اور بے روزگاری کا ایک طویل عرصہ گذارنے کے بعد وہ ممبئی آ گئے ۔ لیکن ممبئی ان سے ممبئی میں ویسے نہیں ملی جیسے احد ہوٹل میں ملتی تھی ۔ سردار جعفری، مجروح اور ساحر کے وہ چہرے جن کو وہ بھوپال سے لے کر آئے تھے وہ انہیں یہاں کہیں نہیں دکھائی دیے۔ یہاں سب اپنی اپنی دکانوں کے دکاندار تھے ۔ اور غیر تجارتی ملاقاتوں سے بیزار تھے۔ وہ یہاں گانے لکھنے آئے تھے لیکن جو یہاں گیت لکھ رہے تھے وہ اس پیشہ میں دوسری شمولیت کے قائل نہیں تھے۔ اور ہوتے بھی کیوں ۔ تاج اپنے دوستوں کی بے رخی کے گلہ مند بھی تھے ان دنوں ان کا میل جول جاں نثار سے تھا جو خود ساحر کے مصاحبوں میں تھے۔

یہاں انہوں نے اپنی کوشش سے ایس ایم ساگر کی چھوٹی فلموں میں گیت بھی لکھے۔ فلم بہو بیگم (فلم ساز جاں نثار کے گیت جو اسکرین پر ساحر کے نام سے مشہور ہوئے، دراصل جاں نثار اور تاج کی شعر سازی تھی۔ لیکن بات نہیں بنی اور پھر ممبئی کی تیز رفتاری اور مصروف زندگی ان کے مزاج کی بھوپالیت کو راس بھی نہیں آئی ۔ چھوٹی بستی کی فرصتوں کی شناسائیوں نے کچھ دن ہی یہاں کی مصروف بے اعتنائیوں کو گوارا کیا پھر وہ وہیں چلے گئے جہاں کا ہر راستہ کئی سلاموں کے ساتھ ان کی آمد کا انتظار کرتا تھا۔ جہاں کے درخت' جانور تالاب سب انہیں ان کے نام سے جانتے تھے ان کے شعری وقار کو پہچانتے تھے۔ تاؔج بھوپال کے الاؤلے شاعر تھے۔ بھوپال نے ان کی شاعری کے ساتھ ان کی آوارگی کو بھی اپنا لیا تھا۔ انہیں نہ ان کی شراب بری لگتی تھی نہ میلے کچیلے کپڑے اکھرتے تھے۔ تاؔج اور بھوپال کے رشتے میں خود تاؔج کے انکسار اور پیار کا بھی بڑا دخل تھا۔ بھوپال اور وہ ایک دوسرے کی عادت بن چکے تھے۔ تاؔج بھوپالی مزاجاً حساس طبیعت محبت کی شدت اور زندگی کی حرارت کے شاعر تھے۔ ان کی اشتراکیت رانگ فیشن کی دین تھی۔ یہ

ان کی خارجی شخصیت کا حصہ تھی ان کے شعور کا قصہ نہیں تھی ان کی شاعری میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جن میں عمداً وہ اپنے آپ کو ترقی پسند ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اور شاعری کو محض منظوم الفاظ بنا دیتے تھے۔ نظریہ ہو یا عقیدہ جب تک رگ وپے میں نہیں اترتا لفظوں میں رنگ نہیں بھرتا۔ تاج نے اپنے مزاج کو کم لکھا مستعمل رواج پر قلم زیادہ چلایا اور اس طرح شعرا کھرے نعرے بن گئے۔ ان کے اس قسم کے شعر اپنے زمانے میں کافی سراہے جاتے تھے۔

آزادی کے اونچے سورج
گلیاں تیرے نام کو ترسیں
کشمیر سے تا ارض دکن چیخ رہے ہیں
سورج ہے کہاں اہل وطن چیخ رہے ہیں
امن کی خاطر زیست کی خاطر سارا مشرق جاگ اٹھا ہے
لاکھوں کروڑوں ہاتھ اٹھیں ہیں دلی سے شنگھائی تک

ایسا نہیں ہے کہ تاج کی پوری شاعری میں صرف ایسے ہی شعر ہوں۔ جب وہ سنی سنائی باتوں کے بجائے اپنے مشاہدہ اور تجربہ پر اعتماد کرتے تھے تو انہیں پرشور شعروں کے ساتھ ان کے مجموعوں میں ایسے شعر بھی نظر آتے تھے جو دھیمے سروں میں اپنی باتیں سناتے تھے۔ ان میں کوئی گہرا تجربہ یا اظہار کا کوئی چونکاتا ہوا معیار تو نہیں ملتا مگر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوئے منظروں، اور زندگی سے قریب کے تجربوں کی سی تازہ کاری ضرور محسوس ہوتی ہے۔ کیفیت اور تاثر کے ساتھ۔ اور یہی تاج کے فن کا حسن ہے ان میں تازگی اور فنکاری کا خوبصورت امتزاج ہے۔

ان میں وہ تاج نظر آتا ہے جس میں اچھے اور اہم شاعر ہونے کے پورے امکانات روشن ہیں

انھیں اور ان کے خط ہی دیکھ ڈالیں
جنہیں دیکھا نہیں اک دو برس سے

تاج کے اس شعر کو جاں نثار نے صفیہ اختر کے خطوط کے مجموعہ ''زیرلب'' کے پہلے صفحہ

پر استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کے نیچے تاج کا نام نہیں ہے۔

تم تو بیگانہ ہوئے جاتے ہو
آؤ پھر گھر کی طرف لوٹ چلیں

جو بھی رقیب شہر میں تھا یاد آ گیا
تم کیا ملے کہ عہد وفا یاد آ گیا

سوچیں گے صبح، دن یہ گذاریں گے کس طرح
فی الحال فکر ہے کہ کہاں رات کیجئے

تاؔج مشاعروں میں اکثر بلائے جاتے تھے مگر وہ مشاعرہ کے اسٹیج پر ایسے نظر آتے تھے جیسے اجنبیوں کی مجمع میں کوئی مجبور بیٹھا ہو۔ جب کلام پڑھنے کے لئے بلائے جاتے تھے تو تالیوں کے شور میں مائک کے سامنے بیٹھے یا کھڑے تو ضرور نظر آتے تھے۔ لیکن کلام سنا کر کب چلے جاتے تھے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کبھی دو تین شعروں سے زیادہ نہیں سناتے تھے۔ اور کبھی تو ایک شعر ہی سنا کر آداب کر لیتے تھے۔ لوگوں کی فرمائش کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ترنم سے پڑھتے تھے۔ پڑھتے وقت آنکھیں بند کر لیتے تھے ان کے پڑھنے کے انداز کو دیکھ کر ستار نواز ولایت خاںؔ کا ایک قول یاد آ جاتا تھا۔ ولایت خاںؔ سے جب کسی نے پوچھا' جب آپ اسٹیج پر اور سننے والے آپ کے سامنے ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں۔ ولایت خاںؔ کا جواب تھا۔ بھئی ستار کو ملانے تک تو میں اسٹیج پر اور روبرو سامعین ہوتے ہیں۔ لیکن بعد میں میں خود بجا رہا ہوتا ہوں خود سن رہا ہوتا ہوں۔ کبیر داسؔ نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا تھا

پریم گلی اتی سانکری، تامیں دونا سماہیں
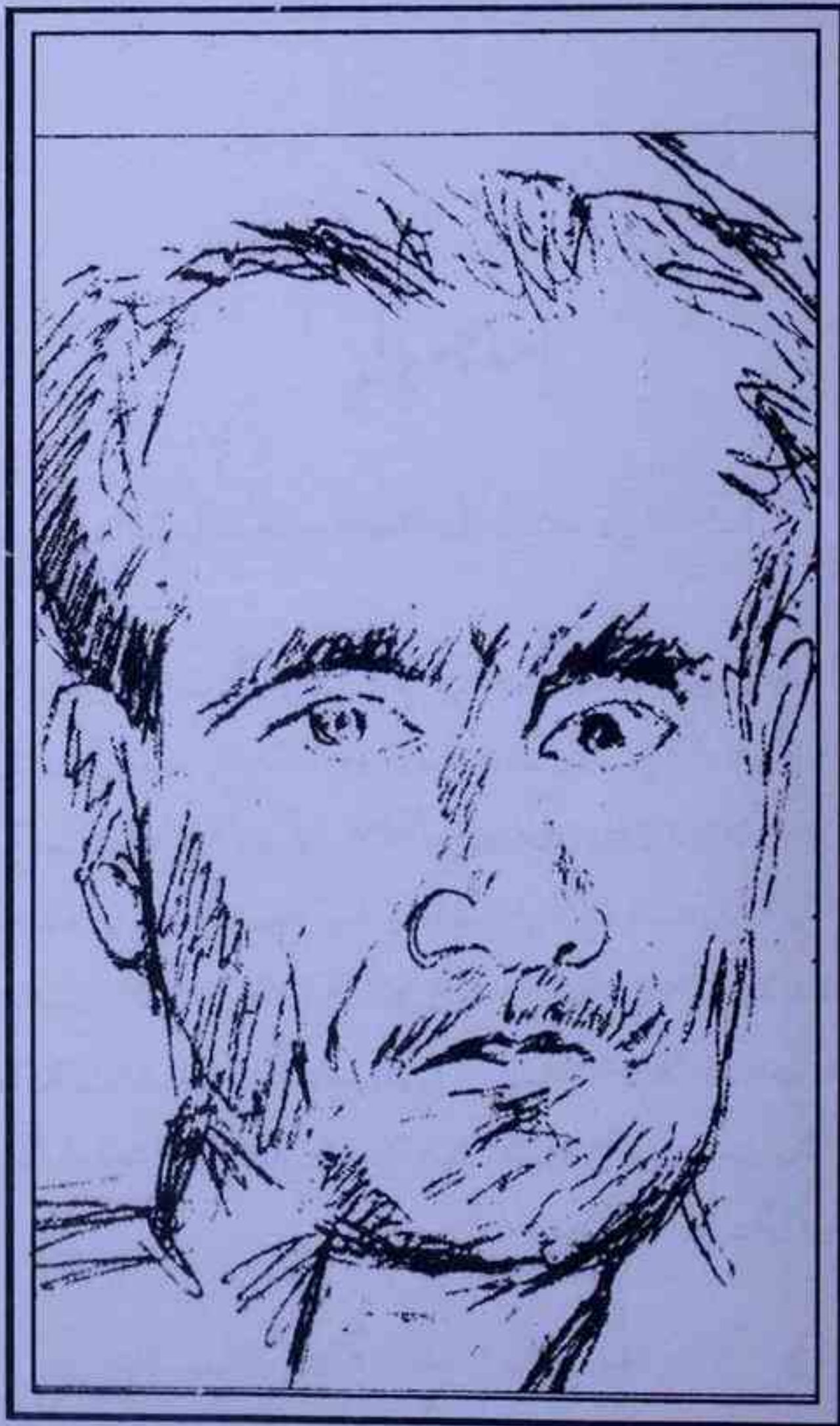
اسد بھوپالی

اسد بھوپالی

ممبئی میں اسد بھوپالی سے میری پہلی ملاقات سڑک کنارے کی ایک شعری نشست میں ہوئی تھی۔

کچھ سال پہلے باندرہ میں لنکنگ روڈ پر موجودہ ٹیلی فون ایکسچینج کے سامنے کی فٹ پاتھ پر ایک ایرانی ہوٹل تھا۔ فیرڈیل۔ ہوٹل کے باہر ایک بڑا سا چبوترا تھا۔ اس کے بائیں کونے میں بڑے تام جھام کی شمبھو مہاراج کی پان کی دکان تھی۔ شمبھو لکھنؤ کے قریب کسی گاؤں کے تھے۔ ممبئی میں آئے انہیں کئی برس ہوگئے تھے، لیکن ان کے لباس، ادب آداب اور گلوریوں کی بناوٹ اور دکان کی سجاوٹ میں مجازؔ لکھنوی کا شہرِ نگاراں اب بھی جھانکتا نظر آتا تھا۔ وہ اردو شاعری کے اس حسن کے مارے ہوئے تھے جو مشاعروں میں پڑھی جاتی ہے اور گلی کوچوں میں قوالیوں میں سنی جاتی ہے۔ انہیں ایسے بہت سے شعر یاد تھے جنہیں وہ، جب پان لگانے سے مہلت پاتے تھے تو کبھی ترنم میں کبھی تحت میں سناتے تھے۔

دیکھ کر جب اس نے چلمن ڈال دی
دیکھنے والوں نے گردن ڈال دی
مرے معشوق کے بس دو پتے ہیں

کمر پتلی صراحی دار گردن
صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے ؟

شعر سنانے کے ساتھ ان کا ایک اور بھی شوق تھا۔ وہ ہر شام ایک مصرع سوچ کر آتے تھے۔ جس پر وہ خود بھی طبع آزمائی فرماتے تھے۔ اور دوسروں سے بھی مصرعے لگواتے تھے۔ جب تک ان کے معیار کے مطابق مصرع چست و درست نہیں لگتا تھا وہ شاعروں سے مسلسل ذہنی کسرت کرواتے تھے۔ ان کی دوکان کے اردگرد اکثر ان شاعروں کا جماؤ ہوتا تھا جو فلموں میں گیت لکھ رہے تھے یا لکھنے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ ایک شام کا مصرع اس طرح تھا۔

''زمانہ بڑے چین سے سو رہا ہے''

ایک صاحب نے فوراً اپنی زود گوئی کا کمال دکھایا اور اس پر مصرع لگایا۔

زمانہ بڑے چین سے سو رہا ہے
جو ہوتا تھا پہلے وہی ہو رہا ہے

دوسرے نے مطلع میں یوں گرہ لگائی۔

زمانہ بڑے چین سے سو رہا ہے
جو تنہا ہے بے گھر ہے ' وہ رو رہا ہے

مصرع پر مصرع لگ رہے تھے مگر شمبھو بار بار گردن ہلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے رہے اتنے میں سب سے الگ تھلگ کھڑے ایک بزرگ کے پان بھرے منہ سے آواز آئی۔

زمانہ بڑے چین سے سو رہا ہے
''تیری ماں کو...... یہ کیا ہو رہا ہے''۔

مصرع فحش تھا مگر رواں دواں تھا۔ شمبھو جو پہلے بار بار نفی میں گردن ہلا رہا تھا یہ مصرع سنتے ہی قہقہہ لگا رہا تھا۔ واہ حضور جیسی طرح استادانہ ویسی ہی گرہ شاعرانہ بس۔ یہیں پر نشست کا

اختتام کیا جاتا ہے اور سب کے لئے چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

حسب معمول ہر نشست کے آخری جملے' شمبھو مہاراج کے ہوتے تھے اور بعد میں چائے اور پان سے تواضع بھی انہیں کے سر ہوتی تھی ممبئی میں باندرہ کے ایک کونے میں بسا وہ چھوٹا سا لکھنؤ کئی برس ہوئے چتا بن کر جل چکا ہے مگر اس کی یاد استادانہ مصرع میں شاعرانہ گرہ کی صورت میں آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس مصرع کے شاعر کا نام اسد بھوپالی تھا۔ اور یہ ممبئی میں میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اسد صاحب رہتے کہیں اور تھے لیکن شام ہوتے ہی وہ باندرہ میں الگ الگ وقت پر تین ٹھکانوں میں نظر آتے تھے۔ جاں نثار اختر کی طرح وہ بھی ہاتھ گھڑی سے وقت کو نہیں بانٹتے تھے' لیکن ہر ٹھکانہ پر ان کے آمد اور رخصت کا وقت ہر روز کی طرح دوسروں کی گھڑیوں کے مطابق متعین ہوتا تھا۔ اس طے شدہ وقت میں تھوڑی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی تھی۔ ان کا پہلا پڑاؤ باندرہ اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلہ پر لگی ہوٹل کے کارنر پر ایک عطر کی دوکان تھا۔ جہاں وہ ایک اسٹول پر بیٹھ کر کسی فلمی گیت کا مکھڑا سوچتے تھے' یا خاموشی سے شور بھری سڑک سے گذرتی حسیناؤں کا نظارہ فرماتے تھے چائے پی کر ایک دو پان کھاتے تھے جب وقت پورا ہو جاتا تھا تو عطر والے سے اپنی پسند کے عطر کی کاڑی بنواتے تھے اور دوسرے ٹھکانے کی طرف رخصت ہو جاتے تھے۔ ان کی شام کی دوسری منزل فیرڈیل کے باہر شمبھو مہاراج کی دوکان تھی وہاں کی نشست ختم کر کے وہ کھار کی ایک گلی میں دیسی شراب کے اڈے میں داخل ہوتے تھے۔ اس اڈہ کا مالک سیہ رنگ کا لمبا چوڑا گوا کا عیسائی تھا اس میکدہ میں اسد صاحب کی وجہ سے اور بھی ہم مذاق لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ اسد صاحب اپنی عمر اور فلمی گیتوں کی مقبولیت کے کارن اڈے پر آنے والے اسٹرگلر شاعروں کی محفلوں کے صدر ہوتے تھے۔ وہ ان کے مکھڑے اور گیت سنتے تھے اور زبان و بیان بھی درست کرتے تھے۔ اڈے کے عیسائی مالک نے اسد صاحب کی میز پر روز کے شور کو سن کر ایک پٹھے پر Qawali is not allowed here لکھ کر دیوار پر لٹکا دیا تھا۔ لیکن اسد صاحب اور ان کے مرید ہر روز اس قانون سازی کو اپنی مشاعرہ بازی سے

توڑ چھوڑ دیتے تھے اسدؔ صاحب کی ایک غزل کے شعر ہیں

جہاں بھی دل نے کوئی ہم سفر تلاش کیا
جو مجھ کو زہر دے وہ چارہ گر تلاش کیا
تمام عمر کہیں چین سے نہ بیٹھ سکے
تمام عمر ترا سنگِ در تلاش کیا

اسدؔ بھوپالی ۱۰ جولائی ۱۹۲۱ء میں اپنے دور کے ایک عالم مولوی محمد خاں کے فرزند منشی احمدؔ خاں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ وراثت کی ذہانت کے ساتھ انہوں نے اپنی محنت سے سعدیہ اور جہانگیریہ اسکولوں اور بعد میں اورینٹیل کالج میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن والد کی بے وقت وفات نے گھر کے ماحول کو بدل دیا اور مالی الجھنوں کی وجہ سے آگے کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ ان کے ادبی ذوق کی ابتدا کالج میں بیت بازی کے ان مقابلوں سے ہوئی جن میں وہ دوسروں کے اشعار خوبصورت مترنم انداز میں سناتے تھے اور ہر بار ہ ٹرافی جیت کر لاتے تھے۔ ایک بار ایسے ہی ایک مقابلہ میں کسی نے نوح ناروی کا شعر جو حرف 'ع' سے شروع ہوتا ہے۔ سنایا اور حرف 'ڑ' پر اسد کو الجھا دیا۔ نوح صاحب کا شعر تھا

عشق کے واسطے ہے دل کی آڑ
کوئی دیکھے یہ تل کی اوٹ پہاڑ

اسد خاموش تھے۔ مقابلہ مخالف پارٹی کے ہاتھ جانے والا تھا۔ دو گھنٹیوں کے بعد تیسری گھنٹی بجنے ہی والی تھی کہ اچانک ان کی مترنم آواز گونجی۔ وہ فی البدیہہ شعر سنا رہے تھے

'ڑے' گر نہ ہو تو ہو نہ فسادوں میں مار دھاڑ
یہ حرف وہ ہے تل کو بناتا ہے جو پہاڑ

سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور پہلے کی طرح اس بار بھی وہ اور ان کی ٹیم ہی انعام کی مستحق ٹھہری یہیں سے ان کی شعر گوئی کی شروعات ہوئی۔ اور وہ اسد اللہ خاں سے اسد بھوپالی بن

گئے۔ شعری بھوپالی نے اس دور کے اسد کے بارے میں یوں رائے دی تھی۔

''اس کے مترنم لب ولہجہ، رواں دواں بحروں کے انتخاب کے علاوہ زود گوئی کی خداداد صلاحیت نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ ایک روز میں اسے لے کر اپنے استاد محترم کے حضور جا پہونچا جہاں اس نے ذکی وارثی کو استاد بنایا اور ایک معتبر شاعر کا مقام پایا۔''

بھوپال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ قیام ۱۹۴۴ء میں عمل میں آیا۔ شہر کے دیگر نوجوان شعراء کی طرح اسد بھی اس سے ہم رشتہ ہو گئے لیکن ان کی ترقی پسندی میں فیشن کا دخل زیادہ تھا۔ اس کے فکر و فلسفہ تک ان کی رسائی سنی سنائی کی شنائی جیسی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی نظموں اور غزلوں میں جہاں جہاں اس فیشن کے اثرات آئے ہیں' ان کے الفاظ صرف شور مچاتے ہیں یا سرخ پرچم اٹھاتے ہیں۔ ان میں شعریت نہیں ہوتی۔

سرخ پرچم ہاتھ میں لے کر بڑھو دیوانہ وار
ہند سے یکسر مٹا دو غیر ملکی اقتدار
جو تمہارا حق دبائیں تم کچل دو ان کا سر
رات کی تاریکیوں میں کیوں ڈرے نور سحر
سر زمین ہند کے مظلوم انسانوں اٹھو
میری دنیا کے قیامت خیز طوفانوں اٹھو

عقیدہ ہو یا نظریہ جب تک رگ و پے میں نہیں اترتا' تخلیقی ادب میں نہیں سنورتا۔ فیض کی شاعری انیس کے مرثیے یا ملٹن کی فردوس گم شدہ تاریخ ادب میں فن و نظریہ کے تخلیقی اشتراک کی زندہ مثالیں ہیں۔ اسد بھوپالی مزاجاً رومانی اور غزل کی اس روایت کے شاعر تھے جو محفلوں میں سنائی جاتی ہے اور عوام میں سراہی جاتی ہے۔ ان کے یہاں الفاظ خوش آہنگ اور مانوس رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بھی مشاعروں کے بیشتر شاعروں کی طرح خداداد صلاحیت پر بھروسہ اور علم و مطالعہ کو فطری شاعری کے لیے خرافات سمجھتے تھے اور بار بار دہرائی باتوں کو اپنی کائنات سمجھتے تھے۔

راتیں تمہاری زلفوں جیسی الجھی الجھی کالی کالی

دن ہیں ہماری آنکھوں جیسے ویراں ویراں خالی خالی
مرا سلام تمنا قبول کر لیجے
غریب دل کا یہ تحفہ قبول کر لیجے

جوانی آپ سے تنہا سنبھل نہیں سکتی
مری نظر کا سہارا قبول کر لیجے
کبھی دیکھ لے مجھے بھی یہ ادائے مہر بانی
تری اک نظر کے صدقے مری ساری زندگانی

اسؔد بھوپالی اپنی خوش آوازی کی وجہ سے مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ ان کا ترنم مجروحؔ سلطان پوری اور جگرؔ کی لے کاری کے امتزاج کا حسن لیے ہوئے تھا۔ سیدھا، صاف اور سریلا اس میں سُر تال کی جانکاری اور شاعرانہ لحن کی فنکاری شامل تھی۔

چوڑی دار پاجامہ پورے بٹن سے کھلی شیروانی اور سفید ململ کے کلف لگے اور پاندان کی ڈبیا سے چُنٹوں بھری آستینوں والے کرتے میں ملبوس جب وہ مائک کے سامنے بیٹھ کر آنکھیں بند کیے آواز میں محویت کے انداز کو شامل کر کے کلام سناتے تھے تو سامعین داد و تحسین سے پر شور ہو جاتے تھے۔ بھوپال میں اسؔد صاحب شعری بھوپالی اور کیفؔ بھوپالی کے بعد کے ان شاعروں میں تھے جو خوش گلوئی سے غزل کو سنوارتے تھے اور مشاعروں کے ماحول کو نکھارتے تھے فلم انڈسٹری کے بند دروازے کو بھی انہوں نے اپنی خوش گلوئی سے ہی کھولا تھا۔ شعری فلم جگنو میں صرف ایک غزل ''جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی' لکھ کر خاموش ہو گئے۔ کیفؔ نے کمال امروہوی کے ساتھ پانچ سات گیتوں تک ہی سفر کیا۔ لیکن اسؔد بھوپالی نے ''ہنستا ہوا نورانی چہرہ'' سے آخری گیت کبوتر جا جا تک فلمی گیت نگاری میں اپنے چالیس سال کھپائے تھے اور کئی فلموں میں اپنی نغمہ نگاری کے جادو جگائے تھے۔ ان کی پہلی فلم دنیا تھی جو فضلی برادرس بنا رہے تھے۔ اس فلم میں دو گانے لکھ کر آرزوؔ لکھنوی پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ نئے گیت کار کے انتخاب کے لئے بھوپال ٹاکیز کے

مالک اور فلم ڈسٹری بیوٹر سگم چند کا پڑانے ایک مشاعرہ اس اعلان کے ساتھ منعقد کیا کہ جو سب سے زیادہ کامیاب ہوگا وہ فلم دنیا میں باقی کے گیت لکھے گا۔ مشاعرہ ہوا اور بیت بازی کے مقابلہ کی طرح اس بار بھی بازی اسد بھوپالی کے ترنم اور مترنم غزل کے حصہ میں آئی۔

ان کی غزل پر سامعین نے جی کھول کر داد دی اور اعلان کے مطابق انہیں بمبئی بلایا گیا ممبئی نے انہیں شہرت بھی دی اور مصیبت بھی دی۔ ان کی شہرت ان کی ذہانت اور گیتوں کی مقبولیت کی وجہ سے تھی اور مصیبت شراب سے ان کی ضرورت سے زیادہ رغبت کی وجہ سے تھی۔ انہوں نے جو کمایا وہ شراب وشباب میں لٹایا۔ نہ بچوں کو ڈھنگ سے پڑھایا لکھایا نہ ممبئی میں اپنا گھر بنوایا۔ ان کی انہیں بے اعتدالیوں کی وجہ سے موسیقار جب ان سے کترانے لگے تھے تو وہ مجبوراً شناساؤں اور اپنے مداحوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے لگے تھے۔ عزیز اختر نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"فلمی دنیا نے جہاں انہیں اعلیٰ سوسائٹی میں بلند مقام عطا کیا وہاں شراب وشباب پرستی کی سوغات بھی بخشی جوان کی زندگی کا ناسور بن گئی"

یہ ناسور ان کی حیات تک مندمل نہیں ہو سکا زندگی کی طرح اسد بھوپالی کی شاعری بھی ان کی بے اعتدالی کا شکار رہی۔ انہوں نے حیات میں نہ کوئی بیاض رکھی نہ کوئی مجموعہ شائع کرایا۔ ان کے انتقال کے بعد اردو اکادمی بھوپال نے ان کے بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کر کے، روشنی دھوپ، چاندنی کے نام سے چھاپا تھا۔

اسد صحت یاب ہونے بھوپال گئے تھے۔ لیکن وہ اپنی آخری فلم کے گیت کبوتر جا جا کی کامیابی کے ذریعہ پھر سے انڈسٹری میں اپنا سکہ جمانے نہیں آ سکے۔ ۹ جون ۱۹۹۰ کی شام ان کی آخری شام تھی۔

اسد کو تم نہیں پہچانتے تعجب ہے
اسے تو شہر کا ہر شخص جانتا ہوگا

دل لکھنوی

دل لکھنوی

دِل لکھنوی کو میں نے پہلی بار اپنی طالب علمی کے زمانہ میں دیکھا تھا۔ گوالیار میں دسمبر میں میلہ لگتا تھا۔ اس میلے میں دوسرے کلچرل پروگراموں کے ساتھ ایک مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ وہ اسی مشاعرے میں شرکت کرنے آئے تھے۔ ان کی شہرت، ان کی آمد سے پہلے مقامی کالج کے لڑکوں لڑکیوں تک پہونچ چکی تھی۔

بڑے بڑے پٹے دار بال جن کی سر پر دو حصوں میں تقسیم کر کے مانگ نکالی گئی تھی۔ سونے کے فریم کا نازک چشمہ جس کے شیشوں سے جھانکتی ہوئی گھنی پلکوں والی آنکھیں' جو آدھے سے زیادہ ہونٹوں کا کام کرتی تھیں۔ ہاتھ میں پان کے لئے چاندی کی جھلجھلاتی نقشین ڈبیا ساتھ میں نیلی اور لال ریشم کی ڈوریوں والا لکھنوی بٹوا جس کی کالی ساٹن میں بہت سارے چھوٹے چھوٹے چاند ستارے روشن تھے۔ کالی سرج کی شیروانی چوڑی دار پاجامہ۔ چھریرا قد آور بدن۔ ہنسی ایسی جو پہلے آنکھوں میں چمکتی تھی پھر ہونٹوں پر قہقہہ بن کر دیر تک کھنکتی تھی۔ وہ دیکھنے میں شاعر سے زیادہ کسی جاگیر کے جاگیردار لگتے تھے۔ دل کافی خوش لباس آدمی تھے۔ وہ اپنی وضع سے الگ سے پہچانے جاتے تھے۔ سر سے پاؤں تک لکھنوی! وہ ان دنوں مشاعروں میں نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ اور قرب و جوار کے ایک دو مشاعرے لوٹ کر ہی مشاعروں کی دنیا کے سلطانہ ڈاکو تسلیم کر لئے گئے تھے۔ یہ جگر مرادآبادی کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ دلؔ' جگرؔ' کے عہد میں ہی جگر کے

بعد مترنم مشاعروں کی تیسری کھیپ کے نمائندہ شاعر تھے، جگر کے فوراً بعد حفیظ جالندھری ساغر نظامیؔ اور بہزاد لکھنوی زیادہ مشہور ہوئے۔ پھر شعری بھوپالی نشور واحدی، شکیل بدایونی اور راز مراد آبادیؔ وغیرہ کی خوش گلوی کی دھوم رہی۔ دل لکھنویؔ جب مشاعروں کی زینت بنے اس وقت ان کے ساتھ مترنم شاعروں میں فنا نظامیؔ کانپوری مضطر اندوریؔ، راز الہ آبادیؔ، ایاز جھانویؔ انور مرزا پوری، بیکل اتساہی، بسمل شاہجہاں پوری اور شاعرات میں یاد دہلوی وغیرہ تھے۔ ان میں سب کے ترنم اپنے اپنے انداز کے تھے۔ مگر آج کے شاعروں کے برعکس وہ صرف خوش آوازی ہی سے نہیں جانے جاتے تھے۔ آواز کے ساتھ الفاظ کا اعجاز بھی دکھاتے تھے۔ ان میں ہر ایک شاعر زبان اور اسکی تہذیب سے واقف تھا۔ شاعری کی کلاسکی اقدار کا جانکار تھا۔ ذہنوں میں اساتذہ کے کلام کا معیار تھا۔ ان دنوں مشاعروں میں ایسے شعر سنے جاتے تھے۔

انہیں دیکھنے کی تمنا نہیں ہے: مگر ہاں کئی دن سے دیکھا نہیں ہے

(عزیز سلونویؔ)

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے: کٹ گئی عمر رات باقی ہے

(خمار بارہ بنکویؔ)

یہ عمارت تو عبادت گاہ ہے: اس جگہ اک میکدہ تھا کیا ہوا

(فنا نظامیؔ)

ابھی تو ایک ہلکی سی خلش محسوس ہوتی ہے: بہت ممکن ہے کل اس کا محبت نام ہو جائے

(شعری بھوپالیؔ)

ہر لحظہ ایک تازہ شکایت ہے آپ سے: اللہ مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

(ریاض جیوائیؔ)

یہ ان بہت سارے شعروں میں سے چند ہیں جو میں نے مشاعروں میں سنے تھے۔ اور سنتے ہی یادداشت کا حصہ بن گئے۔ ان شعروں کا حسن اب تک میرے تنہائیوں کا ہم سفر ہے۔

یہ اور بات ہے' ادب میں ان کو وہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو ان سے کم تر اشعار کے حصہ میں آئی اس کی وجہ بھی تھی۔ ان میں سے بیشتر شاعروں کی ادبی رسائی مشاعروں کے اجتماعات تک محدود تھی ان سے باہر کا ادبی علاقہ ان کی پہونچ سے باہر تھا یا وہ دانستہ اس سے دور تھے......

دل لکھنوی کا نام عبدالرزاق خاں تھا۔ ان کے والد اپنے عہد کے ممتاز صوفیوں میں تھے۔ ان کے معتقدین آج بھی لکھنو میں ان کی درگاہ پر جمع ہو کر ہر سال ان کا عرس مناتے ہیں اور مرحوم کی یادوں پر عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ دل کے والد اڑیسہ کے کسی علاقہ سے آ کر لکھنو میں بسے تھے۔ پیری مریدی کے علاوہ چھوٹا سا کاروبار ہی ذریعہ معاش تھا۔ ان کی دعاؤں نے کئی تاریک گھروں میں چراغ روشن کیے تھے کئی اداس بیویوں کو ان کے ناراض شوہر واپس کیئے تھے۔ دل لکھنوی کی پرورش نماز روضہ اور نذر و نیاز کے مذہبی ماحول میں ہوتی تھی۔ جس کا اثر ان پر اُن کی شاعرانہ بے اعتدالیوں کے باوجود بہت گہرا تھا رات وہ بھلے ہی کیسے بھی گذاریں لیکن ہر دن کی شروعات فجر کی قضا نماز سے ہوتی تھی۔ درگاہوں کی زیارتیں اور بزرگوں کی بزرگی کی برکتیں بھی ان کے معمول میں شامل تھیں۔ جہاں جاتے تھے وہاں بزرگوں کے مزاروں پر حاضری ضرور دیتے تھے۔ لیکن ان کے مذہبی لگاؤ میں وہ الگاؤ نہیں تھا جو ہمیشہ سے سیاست کا سجاؤ رہا ہے۔ اس میں تنگ نظری نہیں تھی کشادگی تھی وہ مذہب کے اس روپ سے میلوں دور تھے جس کے بارے میں اردو غزل کے پہلے ناراض شاعر یگانہ چنگیزی نے اپنی ایک غزل کے مطلع میں کہا تھا۔

سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا ؟
سر پھرا دے انساں کا ایسا خبط مذہب کیا ؟

دل کے مذہب میں خبط مذہب نہیں تھا۔ مذہب کی اصل روح روشن تھی۔ وہ انسان کو اس کی انسانیت کے حوالے سے پہچانتے تھے' اور اسی محبت کو اپنا مسجود مانتے تھے۔ ان کا مذہب مولویانہ سے زیادہ صوفیانہ تھا۔ جس میں خدا اور بندہ کے درمیان غیر شروط رشتہ ہوتا ہے۔

شاعری ان کا شوق تھا پیشہ نہیں تھا۔ گھر میں موروثی تجارت تھی۔ ان کے والد نے لکھنو آ کر بیڑی بنانے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ ان کے بعد اسی کاروبار کو دل نے ذریعہ معاش بنایا اور

خوب پیسہ کمایا۔ ان کے کارخانے کی بیڑی، لکھنؤ اور قریب کے علاقوں میں 'دل نواز' بیڑی کے نام سے مشہور تھی۔ دل نواز ان کے بڑے لڑکے کا نام تھا۔ جواب لکھنؤ کے گلی کوچوں میں خود آٹو رکشا چلاتا بھی ہے اور کرائے پر چلواتا بھی ہے۔ دل لکھنوی کو ان کے باپ کے پیار نے مکتب کی ابتدائی تعلیم سے آگے نہیں پڑھنے دیا۔ اور دل نے اپنے بیٹے کو خود سے آگے نہیں بڑھنے دیا: دل نواز نے شروع میں اپنی خوش گلوئی کو مشاعرے کے حوالے کیا تھا لیکن جب مشاعروں کے سامعین نے انہیں دل کا بدل نہیں مانا تو اس نے بھی دوسرا ذریعہ معاش تلاش کر لیا۔

دل عبدالباری آسی کے شاگرد تھے جو مرزا داغ کے مشہور شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں۔ دل اپنے استاد کی طرح داغ و امیر کے قبیلے کے شاعر تھے۔ کسے کسائے چست مصرعے' زبان کا ڈرامائی استعمال' شوخی وطراری' محاوروں کی فنکاری' اور قافیوں کی ایسی خوش آہنگی جیسے کلدار پر کلدار بجتا ہو ان کی شاعری کی بھی نمایاں خصوصیات تھیں۔ ان کے شعر تنہائی کی سوچ سے ضرور عاری تھے لیکن جس اسکول کے وہ شاعر تھے اسکے لحاظ سے کافی معیاری تھے۔

سنا ہے وہ کل آئیں گے منہ اندھیرے : سویرا نہ کردیں سویرے سویرے
چین بن دیکھے ان کو نہ آئے : اور دیکھیں تو دیکھا نہ جائے
گھٹا اودھی اودھی یہ موسم سہانا : الٰہی مری آج توبہ بچانا
ابھی اپنی توبہ کے ٹکڑے اڑا دوں : مگر شرط ہے اپنے ہاتھوں پلانا

یہ شعر جب مشاعرہ کے اسٹیج سے پڑھے جاتے تھے تو چھتیں اڑ جاتی تھیں۔ تالیوں اور داد کا وہ شور ہوتا تھا کہ ماؤں کی گودوں میں ہنستے ہنساتے بچے بھی گھبرا کے چلانا شروع کردیتے تھے۔ دل دوزانو ہو کر' اکثر بیٹھ کے پڑھتے تھے۔ وہ ہر شعر کے پہلے مصرعے کو تین بار دہراتے تھے۔ پہلے دھیمے سروں میں اسے گنگناتے تھے اس کے بعد پہلے سے اونچے سُروں میں اسے سجاتے تھے۔ پھر کان پر ہاتھ رکھ کر جب اسے تیسری بار اٹھاتے تھے تو ہارمونیم کے سارے پردوں کو پھلانگ جاتے تھے۔ اتنے اونچے سروں تک پہونچنے کے بعد بھی' ان کی آواز کی رعنائی اور گولائی

میں فرق نہیں آتا تھا پہلے مصرع کو اس طرح تین بار دہرا کر جب وہ سدھی ہوئی آواز کو ذرا دھیما کر کے دوسرا مصرع ادا کرتے تھے تو سامعین اپنی نشت سے ایک ایک فٹ اونچا اٹھ کر جھومتے نظر آتے تھے۔ دل کا ترنم اپنے دور کا ایک مثالی ترنم تھا۔ وہ شعر نہیں سناتے تھے الفاظ اور آواز کا ایسا جادو جگاتے تھے جسے وہی یقین کر سکتے ہیں جنہیں انہیں دیکھنے اور سننے کا تجربہ ہوا ہے۔ میں نے ایک سے ایک اچھے ترنم والے شاعر سنے ہیں، لیکن دل اپنے انداز اور آواز کے ایک ایسے شاعر تھے جس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ پھر نہ ایسی ادائیگی سامنے آئی اور نہ ایسی لے کاری آواز میں جگمگائی۔

دل لکھنوی کے ان کی حیات میں دو مجموعے شائع ہوئے تھے۔ پہلے کا نام آئینۂ دل تھا دوسرا لغزشیں کے ٹائٹل سے چھپا تھا۔ ان میں غزلیں اور قلعات شامل ہیں۔ ان کے قطعے کافی خمار آلود ہوتے تھے جو مشاعرہ میں بہت پسند کئے جاتے تھے۔ ایک قطعہ جو وہ اکثر سناتے تھے یوں ہے۔

ہاتھوں میں بڑھ کے جام لیا اور پی گئے
یوں احترام شام کیا اور پی گئے
زاہد نے جب کہا کہ مئے ناب ہے حرام
اللہ میاں کا نام لیا اور پی گئے

گوالیار میلے کے جس مشاعرہ میں دل آئے تھے اس میں جگر مرادآبادی بھی مدعو تھے۔ مشاعرہ میں سامعین جگر کو ہی سننے آئے تھے۔ ان کی شہرت ان دنوں فلمی اداکاروں جیسی تھی۔ جو اردو جانتے تھے وہ ان کے کلام سے فیضیاب ہونے آئے تھے دوسری زبانوں کے لوگ ان کے دیدار کرنے آئے تھے۔ مشاعرہ میں دل لکھنوی کے بار بار پڑھنے کے بعد جب جگر صاحب کو زحمت کلام دی گئی تو مشاعرہ کچھ دیر کو کچھ نوجوانوں کی وجہ سے ہنگامہ میں بدل گیا۔ جگر صاحب نے ابھی غزل شروع بھی نہیں کی تھی ابھی وہ حسب معمول ترنم سیٹ ہی کر رہے تھے کہ دل کو بلائیے

دل کو بلائیے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جگر صاحب خاموشی سے اٹھ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ دل یہ دیکھ کر فوراً لپک کر مائک پر آ گئے۔ ہال میں پھر سے استقبال کی تالیاں بجنے لگیں۔ لیکن دل اس بار غزل نہیں سنا رہے تھے' تقریر فرما رہے تھے......

''مجھے نہایت افسوس اور شرمندگی کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ حضرات کے رویہ سے مجھے بہت تکلیف پہونچی ہے۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ آپ نے کس کی شان میں گستاخی کرنے کی بھول کی ہے۔ جگر مرادآبادی وہ شخصیت ہیں جنہیں دیکھنے اور سننے کی سعادت قسمت سے ہاتھ آتی ہے۔ دل جیسے شاعر آئیں گے' چلے جائیں گے مگر جگر کے نام کے حرف ادب کی تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ جگمگائیں گے۔ خدا کے لئے حضرت جگر کی موجودگی میں مرا نام لے کر میری تذلیل نہیں کیجئے''۔

دل اپنی مختصر سی تقریر کے بعد کافی منت سماجت کر کے جگر صاحب کو پھر سے مائک پر لائے۔ اس کے بعد مشاعرہ میں صرف جگر اور سامعین تھے اور ساتھ میں فرمائشوں کی بھرمار تھی۔

کیا حسن نے سمجھا ہے، کیا عشق نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

یہ اس وقت کی بات ہے جب مشاعرہ اور کتاب میں اتنی دوری نہیں پیدا ہوئی تھی جتنی آج نظر آتی ہے۔ پہلے مشاعروں کے شعراء بھی ادبی شخصیات کو ادب کے حوالے سے جانتے تھے اور مانتے تھے۔ اور آج ایسے شعر پڑھے جاتے ہیں......

کہہ دو میر و غالب سے ہم بھی شعر کہتے ہیں
وہ صدی تمہاری تھی یہ صدی ہماری ہے

دل کی مشاعروں میں مقبولیت کے ساتھ ان کی بلانوشی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور اس کے ساتھ آواز کا وہ جادو بھی کھوتا رہا ہے جو ایک زمانہ میں ان کی پہچان تھا مشاعروں میں دل کی مقبولیت حیرت انگیز تھی۔ لیکن وہ اس مقبولیت کو سنبھال نہیں پائے۔ خدا نے انہیں آواز کا جو تحفہ

عطا کیا تھا اسے انہوں نے وقت سے پہلے ضائع کر دیا۔ ایک رات لکھنؤ میں غیر حالت میں رکشا میں شہر کا نظارہ کرتے گھوم رہے تھے کہ کسی کار سے ٹکرا گئے۔ اور پھر ہاتھ پاؤں توڑ کر بستر پر ایسے لیٹے کہ دوبارہ زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکے اور وہیں سے، مشاعروں کی ساری تالیاں آواز کی ساری بجلیاں، غزل اور قطعات کی ساری شوخیاں اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو گئے۔ انہیں کا ایک شعر۔

موت کیا ہے زمانہ کو سمجھاؤں کیا
اک مسافر تھا رستہ میں نیند آ گئی

لیکن اس نیند پر کئی جگاریں ابھی واجب تھیں جن کی ادائیگی وہ نہیں کر پائے۔
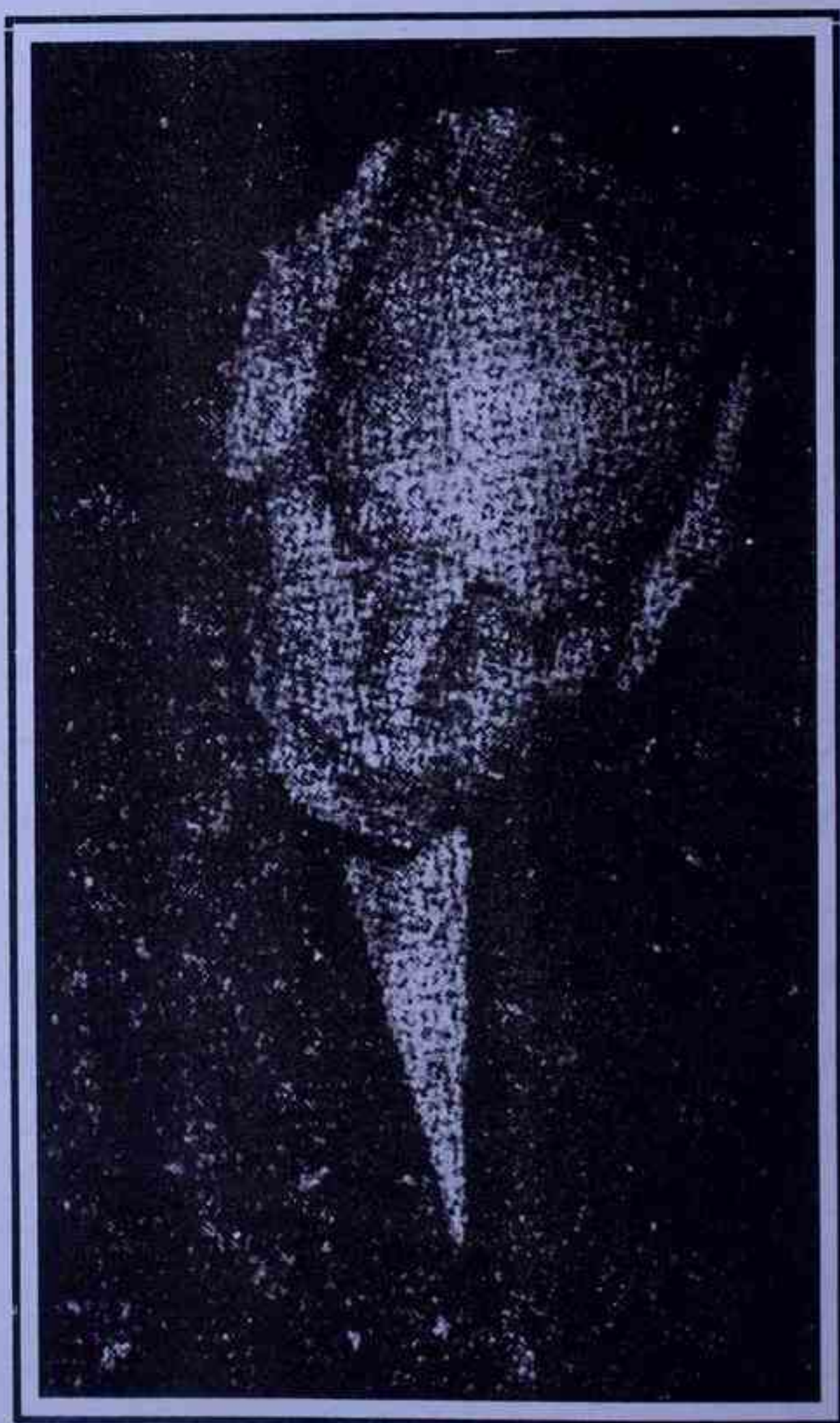
تاباں جھانسوی

تاباں جھانسوی

تاباں جھانوی (پ ۱۹۲۲، م ۱۹۸۶) میری طالب علمی کے زمانہ کے مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔

خدا نے جسم اور چہرہ مہرہ اچھا دیا تھا۔ آواز بھی میٹھی، اور پرکشش تھی۔ لیکن وہ سنت کبیر کی روش "جیوں کی تیوں دھر دینی چدریا" کے قائل نہیں تھے۔ کبیر سنت تھے اور وہ ہم جیسے عام آدمی تھے۔ انہوں نے اس جسم کی چادر کو اس طرح اوڑھا بچھایا کہ وہ وقت سے پہلے داغدار ہو کر جگہ جگہ سے میلی ہو کر پھٹنے لگی تھی۔ ان کا رنگ روپ ہر ملاقات کے ساتھ تھوڑا تھوڑا بدلتا جاتا تھا۔ جب ملتے تھے پہلے سے مختلف ہوتے تھے۔ شروع میں صرف انگور زادی سے دوستی تھی۔ بعد میں اس دوستی میں گانجے کی سرشاری اور افیم کی دلداری بھی شامل ہوگئی تھی۔ انہوں نے اپنی بے اصولیوں کے بارے میں خود کہا تھا۔

ان بے اصولیوں سے جواں ہے میری حیات
سویا ہوں سارا دن کبھی جاگا ہوں ساری رات

وہ ۶۴ سال تک مسلسل سونے کے وقت جاگتے رہے اور جاگنے کے وقت سوتے رہے!
ان کی شاعری انہیں بے اصولیوں کی کہانی ہے جسے وہ قسط وار اس زمانے کے رسالوں 'عالم گیر'، خیام' رہنمائے تعلیم'، شمع' خاتونِ مشرق وغیرہ میں چھپواتے بھی تھے اور مشاعروں میں مخصوص ترنم

میں سناتے بھی تھے۔ آواز میں ایک عجیب قسم کی دردمندانہ کیفیت تھی جوان کے چہرے کی سنجیدگی اور آنکھوں سے جھانکتی گہری اداسی سے بہت میل کھاتی تھی۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں شامل الفاظ جو مشاعروں میں ان دنوں پڑھی جانے والی سکہ بند شاعری سے تھوڑے مختلف ہوتے تھے' اس آواز میں بھلے لگتے تھے۔ انہیں مشاعروں کی خاموشی سے داد ملتی تھی۔ ان کے شروع ہوتے ہی ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ لیکن جیسے ہی وہ ختم کر کے اٹھنے کو ہوتے تھے تو پورا مشاعرہ ایک آواز میں انہیں پھر سنانے کو مجبور کر دیتا تھا۔

تاباں صاحب کے گھر کا نام اختر عالم تھا ابتدا میں دو تخلص رکھتے تھے۔ تاباںؔ جھانسوی کے نام سے مشاعروں میں جانے جاتے تھے اور ۴۵۴ جھانسوی کے تخلص سے رسالوں میں پہچانے جاتے تھے۔ جب مشاعروں میں زیادہ بلائے جانے لگے تو ۴۵۴، کو جو تاباںؔ میں شامل حروف کے اعداد سے ترتیب دیا گیا تھا' ترک کر کے صرف تاباںؔ جھانسوی بن گئے۔ تاباں کو قدرت نے جسم چہرہ اور آواز کی طرح شعر گوئی کی ذہانت سے بھی نوازا تھا۔ لیکن اس ذہانت کا بھی وہ جائز استعمال نہیں کر سکے۔ شروع کے چند سالوں کو چھوڑ کر وہ رسالے اور کتابوں سے بے تعلق ہو کر صرف نئے نئے نشوں اور مشاعروں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے مزاج میں جدت اور طبیعت میں انفرادیت ضرور تھی مگر ان کو سہارنے اور سنوارنے کے لیے جو ریاضت اور فرصت درکار تھی' اس سے ان کی رندانہ سرشت بیزار تھی۔

ایک دن کئی برسوں کے بعد بمبئی میں مکتبہ جامعہ کی فٹ پاتھ پر مل گئے۔ تھکے ہارے پریشاں حال۔ جسم سے ڈھیلے اور چہرے سے پیلے نظر آتے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا' گیت کار اندیور انہیں جھانسی سے لے آئے تھے۔ کچھ دن اپنے ساتھ رکھا پھر باہر کر دیا۔ تاباںؔ کے کہنے کے مطابق' اندیور انہیں جھانسی کے ایک پروگرام میں ملے تھے۔ وہاں انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ممبئی میں انہیں بھی فلموں میں گیت لکھنے کا کام دلوائیں گے۔ اندیور کا وعدہ محض ایک جھانسا تھا۔ وہ تین چار دن مسلسل ان کی غزلیں اور نظمیں اپنے ٹیپ ریکارڈر میں صدا بند کرتے رہے اور جب ان کے

پاس سنانے کو کچھ نہیں رہا تو یہ کہہ کے رخصت کر دیا۔ ''اب آپ جائیے۔ اندیور جی جب آپ کو پھر بلائیں تو ہی آئیے۔''

اندیور کے سر پر بال نہیں تھے۔ اس گنجے پن کو چھپانے کے لئے ان کے پاس چھوٹی بڑی دو وگیں تھیں۔ وہ ہر آنے والے کو پہلے دروازے میں بنے سوراخ سے دیکھتے تھے اور پھر ان دو وگوں میں سے کسی ایک کو پہن کر دروازہ کھولتے تھے۔ ایک وگ پہن کر وہ مہمان کا ستکار کرتے تھے دوسری کو پہن کر گھر میں خود کے نہ ہونے کا انکار کرتے تھے۔ ان دونوں وگوں میں ان کے چہرے الگ الگ نظر آتے تھے تاباںؔ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب وہ ایک دن باہر سے بیٹری لے کر واپس لوٹے تو اندیور اتنی دیر میں انکار والی وگ اپنے سر پر رکھ چکے تھے۔ تاباںؔ مجبوراً اپنے ٹین کا بکس لے کر مکتبہ کی طرف چلے آئے۔ اندیور کا یہ رویہ صرف تاباںؔ کے ساتھ نہیں تھا۔ ان کی اقرار اور انکار والی وگوں کا تماشہ اور بھی کئی دیکھ چکے تھے۔ ایک بار ان کی جھانسی سے آئی ہوئی بیوی کو بھی یہ عذاب جھیلنا پڑ گیا تھا۔ اور وہ ان سے الگ ہو کر کسی قریب کی بلڈنگ میں چوکیداری کی نوکری کرنے لگی تھی......

تاباںؔ جب مکتبہ جامعہ میں ملے تھے' تو بھوکے بھی تھے اور پیاسے بھی تھے۔ ان دنوں میرے حالات بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں تھے۔ آدمی اپنی پریشانی سے ہی دوسرے کی پریشانی محسوس کرتا ہے۔ مجھے تاباںؔ کی حالت پر ترس آیا اور میں نے فوراً اپنے ایک بزنس مین دوست ہندی کے کوی کنتل کمار جین کو فون کر کے ان کے لیے جام' طعام' اور انعام کا انتظام کرا دیا۔ کنتل کمار کے یہاں ہر اتوار کو ایک ادبی نشست ہوتی تھی۔ اس میں پہلے ادیب اور شاعر اپنی تخلیقات پڑھتے تھے۔ پھر بحث مباحثہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد پینا پلانا ہوتا تھا۔ بند کمرہ میں۔ خاموشی سے۔ جین پریوار کے ان آداب سے میں نے تاباںؔ کو آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن ان کی پیاس ان گھریلو آداب کے قائل نہ تھی۔ ان سے کہا گیا تھا' شراب نوشی کم اور احتیاط سے کرنی ہوگی۔ لیکن انہوں نے یہاں بھی وہی کیا جس کے وہ عادی تھے۔ فیضؔ کا شعر ہے:

پہلے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

وہ روکنے ٹوکنے کے باوجود ضرورت سے زیادہ نشہ میں ہو گئے۔ اور ساری محفل کو بدمزہ کردیا۔ عمر نے جسمانی اعضاء پر گرفت ڈھیلی کردی تھی۔ تاباں ضرور تاباہر جانا چاہتے تھے' اور میزبان اپنے گھر والوں کے ڈر سے دروازہ کی چٹخنی نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ تاباںؔ اس غیر ضروری پابندی پر غصہ کرنے کے بجائے تھوڑے وقفہ کے بعد اچانک قہقہوں کے ساتھ ہنسنے لگے اور حاضرین نے دیکھا انہوں نے جو شراب پی تھی اسے وہ واپس صاف شفاف فرش پر میزبان کو لوٹا رہے تھے۔ تاباںؔ کی اس قرض ادائیگی پر کلتل کمارؔ ایسا ناراض ہوا کہ اس شام' طے شدہ انعام اور طعام کے بغیر ہمیں واپس آنا پڑا اور بھنڈی بازار کے ٹھیلے پر اپنی تنگ جیب سے الٹا سیدھا کھانا پڑا۔

تاباںؔ مزاجاً شریف طبع اور کم سخن انسان تھے۔ لیکن مسلسل بے روزگاری اور مشاعرہ کی شب بیداریوں نے انہیں کئی بے اعتدالیوں کا عادی بنادیا تھا۔ وہ دن میں بھی غیر حالت میں ہوتے تھے اور رات کو بھی سارے حواس گند کر کے سوتے تھے۔ رات دن کی نشہ بازی نے صحت کو ہی خراب نہیں کیا' مشاعروں کے منتظمین نے بھی ان سے اجتناب کرنا شروع کردیا تھا۔ بیوی دو لڑکیوں کو ان کے حوالے کر کے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ان بچیوں کی پرورش کے لئے ان کے سامنے ممبئی میں قسمت آزمانے کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ لیکن جن دنوں وہ پہلی بار جھانسی سے ممبئی میں آئے تھے تو ان کے ساتھ جوانی تھی' طبیعت میں روانی تھی۔ اس وقت وہ فکر روزگار کے بجائے حسنِ یار کے شکار ہو گئے اور ایک سے دو ہو کر واپس ہو لیے۔ لیکن اس باران کے پاس تندرست ہاتھ پاؤں تھے نہ سانسوں کی زیادہ پونجی تھی۔ وہ کوشش ضرور کرتے تھے لیکن اس کوشش کو کبھی جسمانی کمزوری روکتی تھی۔ کبھی شراب ٹوکتی تھی۔ ان دنوں مجھے' کافی تگ ودو کے بعد رہنے کو ایک اپنا گھر مل گیا تھا۔ بنا عورت کے اس گھر میں' میں نے ان کے لئے گنجائش نکال لی تھی۔ ہر سویرے انہیں آنے جانے کے مصارف کے ساتھ ان ٹھکانوں کے پتے بھی دیے جاتے' جہاں

سے آمدنی کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی تھی لیکن وہ آنے جانے کے مصارف کے پیسوں سے خریدی ہوئی سستی شراب میں سارے پتے گھول کر پی جاتے تھے۔ ان دنوں میرا گھر مقامی اور بیرونی ادیبوں اور شاعروں کا اڈا بنا ہوا تھا۔ سارا گھر رات کو دیر تک جاگتا تھا۔

ایک رات 'اس روز کی شب بیداری میں غیاث احمد گدی اور پاکستان کے مشہور شاعر اقبالؔ ساجد بھی شریک تھے۔ اقبالؔ ساجد پاکستان میں غزل کے بہت اہم شاعر تھے۔ جن شاعروں نے غزل کی پوری تہذیب کے ساتھ' اسے رائج رومانویت کے آسیب سے آزاد کیا تھا۔ ان میں شکیب جلالی، حسن نعیم، بانی شاذ تمکنت، ناصر وغیرہ کے ساتھ اقبالؔ ساجد کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ساجدؔ کی ایک غزل کیا پیاس لکھوں' پیاس لکھوں کی ردیف کو لے کر ہندو پاک کے کئی شاعروں نے غزلیں تعمیر کی تھیں۔ اقبالؔ ساجدؔ کا ایک شعر سرحد پار کر کے اردو دنیا میں بول چال کا محاورہ بن چکا ہے۔ شعر یوں ہے

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو ہم ایسے گھر میں رہتے ہیں

اقبالؔ ساجد بھی تاباںؔ جھانسوی کی طرح بلانوش تھے۔ ان کی پیاس پاکستان میں مذہبی پابندیوں سے آزاد ہو کر آئی تھی۔ وہ پہلی بار ہندوستان آئے تھے اور اپنے ساتھ برسوں کی تشنگی لائے تھے۔ رات کے گیارہ بجے تک' ڈیڑھ لٹر کی بوتل وقت سے پہلے بے خبر ہو کر سو گئی لیکن اس کے ختم ہونے کے بعد ساجدؔ کی پیاس اور شدید ہو گئی۔ میں نے تاباںؔ صاحب کو جو محفل میں شریک تھے' روپے دیے اور کہیں سے کچھ اور کا انتظام کرنے کی گذارش کی ...... وہ فوراً اٹھ کر چل دیے۔ وہ گیارہ بجے کے گئے دو بجے لوٹے اور وہ بھی خالی ہاتھ۔ ڈانڈا جیسے مچھلی اور شراب کے علاقہ میں انہیں کہیں کچھ نہیں ملا یہ میرے لیے تعجب کی بات تھی۔ جب میں نے خود جانے کے ارادہ سے ان سے روپے مانگے تو نہایت معصومی اور نشہ سے لڑکھڑاتی زبان میں انہوں نے فرمایا۔ "یار تم بھی عجیب آدمی ہو' میرے پاس اب کیا ہے' جو رقم تم نے دی تھی وہ تو شراب کی تلاش میں

ٹیکسی پر خرچ ہوگئی۔ کئی جگہ ٹیکسی گھمائی مگر کہیں سے کچھ۔ ہاتھ نہیں لگا۔

اس وقت تاباں کی حالت دیکھ کر مجھے لگا بہت دنوں کے بعد وہ گھر سے اپنی دوری وعمر کی معذوری اور حالات کی مجبوری کو مکمل طور سے بھول چکے ہیں۔ اس رات وہ کئی راتوں کی نیند ایک ساتھ سو کر دن کے دو ۲ بجے جاگے تھے۔

مری حیات کیا ہے مجھے کچھ پتہ نہیں
یہ کائنات کیا ہے مجھے کچھ پتہ نہیں
اک بات سوچتا ہی چلا جا رہا ہوں میں
جانے وہ بات کیا ہے مجھے کچھ پتہ نہیں

انہیں کے دو شعر اور دیکھئے

مجھ پر کسی نظر کے ارمان ہنس رہے ہیں
دانا تو چپ کھڑے ہیں نادان ہنس رہے ہیں
دریا کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے
ملاّح رو رہا ہے طوفاں ہنس رہے ہیں

تاباں نے جب مشاعرہ پڑھنا شروع کیا تھا' اس وقت تک مشاعرہ پیشہ نہیں بنا تھا۔ نا شاعر اور نا شاعرات کی وہ بھیڑ تب نہیں تھی جو آج اسٹیج پر نظر آتی ہے۔ مشاعروں میں شامل شاعر نہ ادب سے آج کی طرح دور تھے نہ دوسروں سے لکھواتے تھے۔ وہ اردو رسم الخط میں اپنا کلام ہی سناتے تھے اور آواز کے ساتھ شعر گوئی کی بھی داد پاتے تھے۔

تاباں جس سماج میں تھے اس سے باخبر تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے یہ باخبری اس بے خبری کے حسن سے آشنا نہیں ہو سکی جس کے بغیر لفظوں میں جادو نہیں بولتا۔ انہوں نے زندگی کی شباہتوں کو جیوں کا تیوں دہرایا انہیں اپنا ہم راز نہیں بنایا۔ وہ کم کہنے والے شاعر تھے۔ لیکن ان کا جو بھی کلام

تھا وہ ایک بیاض ہی میں محفوظ رہا ان کی حیات میں ان کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا۔

ایک رات سوتے سوتے اچانک جاگ گئے اور دو بجے کے قریب مجھے جگایا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ انہوں نے خواب میں اپنے چھوٹے بھائی ایاز جھانسوی کے کم سن بیٹے کو دیکھا تھا۔ اور وہ رو رو کر انہیں پکار رہا تھا۔ خواب میں اس بچہ کے پکارنے کی وجہ سے وہ رات کو ہی جھانسی روانہ ہونا چاہتے تھے میں نے ان سے صبح تک انتظار کرنے کو کہا لیکن وہ نہیں مانے اور اپنا ٹین کا بکس لے کر وداع ہو گئے۔ یہ ان سے مری آخری ملاقات تھی۔ پتہ نہیں اس رات خواب میں بچہ کی آہ وزاری نے انہیں جگایا تھا یا جھانسی میں ان کی موت نے انہیں بلایا تھا۔

وہ شام آئی وہ چمکے تارے وہ بے قراروں کو نیند آئی
فضا نے اوڑھا سیاہیوں کو حسیں نظاروں کو نیند آئی

اختر نظمی

اختر نظمی

اختر نظمی سے میری پہلی ملاقات بھوپال کے ایک علاقہ اتوارے کے چوراہے پر ایک پرانے لیمپ پوسٹ کے نیچے ہوئی تھی جہاں ہر رات کو نئے شاعروں اور ادیبوں کا جماؤ ہوتا تھا۔ اس علاقہ میں دن میں شفا کلنک میں شاعر جمتے تھے رات کو لیمپ پوسٹ کے نیچے چبوترے پر نئے شاعر رمتے تھے۔

چھوٹے شہر رات کو جلدی سوتے ہیں اور سویرے مرغ کی اذان کے ساتھ جاگ جاتے ہیں۔ رات کے نو ساڑھے نو بجے تک پوری بستی خراٹے لینے لگتی تھی لیکن پرانے بھوپال کا یہ چوراہا ان پابندیوں سے آزاد تھا۔ جب شہر کے سارے چھوٹے بڑے چائے خانے صبح جلدی جاگنے کے لئے رات میں جلدی بند ہو جاتے تھے تو بحث و مباحثہ کے نامکمل جملے اور غزلیں وہاں سے اٹھ کر یہاں مکمل ہونے چلی آتی تھیں۔ یہ لیمپ پوسٹ کا چوراہا کافی مشہور تھا۔ شہر کے مختلف گوشوں سے یار دوست یہاں آ کر ملتے تھے۔ اس چوراہے کے کلب کی بائیں جانب مولوی ناظر کی پان کی دکان تھی۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ مزاحیہ شعر کہتے تھے ان کے مزاح کا ہدف ہمیشہ مرزا غالب کی کوئی زمین ہوتی تھی ایک شعر یوں ہے۔

جاتا ہوں جہاں بھی میں یہی ہوتا ہے عالم
بیوی مرے پیچھے ہے تو بچہ مرے آگے

مولوی صاحب لال ٹین کی روشنی میں کبھی اپنے گول سے چہرہ پر چھگی داڑھی کو کھجاتے تھے، کبھی لیمپ پوسٹ سے آتی آواز کو سن کر پان لگاتے تھے۔ وہ بھی جب نئی ہزل ہوتی تھی تو کلب میں سنانے آجاتے تھے۔ اس پان کی دکان کے سامنے چھوٹے پہلوان کا ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا۔ یہ دونوں دکانیں اس وقت تک چائے اور پان سپلائی کرتی رہتی تھیں جب تک نشست برخاست نہیں ہو جاتی تھی۔ ایسی ہی ایک نشست میں ایک بار پچیس چھبیس سال کا ایک اجنبی نوجوان کالے گرم سوٹ اور ٹائی میں موٹر سائیکل پر آکر شریک ہوا تھا۔ سیاہی مائل رنگ، آنکھوں میں ذہانت چہرہ پر متانت وہ محفل میں شریک ہو کر بھی غیر موجود سا لگتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ آپ ہی آپ گنگناتا تھا اور پھر خود ہی خاموش ہو جاتا تھا۔ محفل میں اس کی شرکت ایک دو جملوں کی زحمت سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ اس وقت اس کا نام سید اختر جمیل تھا۔ وہ نیا نیا بھوپال میں وارد ہوا تھا۔ اردو میں گولڈ میڈل کے ساتھ فرسٹ کلاس میں ایم اے کر چکا تھا۔ اب فارسی میں ایم اے کی تیاری کر رہا تھا۔ شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن گھر کے نام میں ابھی اختر نظمی کا اضافہ ہونا باقی تھا۔ دوستوں کے اصرار پر اس نے اس رات نہایت خوش آواز ترنم میں ایک غزل سنائی تھی۔ اس کا مطلع اور ایک شعر آج بھی ذہن میں محفوظ ہیں۔

اب نہیں لوٹ کے آنے والا
گھر کھلا چھوڑ کے جانے والا

صرف آواز ہے چاروں جانب
کون ہے مجھ کو بلانے والا

اختر نظمی کی سرل سچ مگر رمزیاتی جگمگاہٹ لئے ہوئے اشعار نے آواز کی حلاوت میں

مل کر اس وقت سماں باندھ دیا تھا۔ غزل ختم ہونے کے بعد بھی گھر کھلا چھوڑ کے جانے والا۔ یا کون ہے مجھ کو بلانے والا جیسے تیکھے مصرعے مالوہ کی خشک رات میں شراروں کی طرح چمک رہے تھے۔ ان اشعار میں میں عام لفظوں کے تخلیقی برتاؤ اور سنجیدہ رچاؤ میں ان کے شعری مستقبل کا سجاؤ نمایاں تھا۔

اختر نظمی کو ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد سید ممتاز الدین چیف سکریڑی کے اعلی عہدہ پر فائز تھے۔ اپنے اصلی نام سے وہ سرکاری ملازمت کرتے تھے۔ بیخود تخلص سے شعر کہتے تھے اور نثر لکھتے تھے۔ اختر نظمی کی شعری ذہانت اسی رشتے کی امانت تھی۔ جس کا انہوں نے تحریری اقرار بھی کیا تھا۔

''زندگی نے مجھے ایسا گھر' ایسا ماحول' ایسا سماج دیا جس پر مجھے فخر ہے۔ میں نے جو کچھ سیکھا' اپنے والد سے سیکھا ہے۔ انہوں نے مجھے باقاعدہ اصلاح تو نہیں دی لیکن ان کی باتوں' خاموشیوں اور کتابوں سے ان کی رات دن کی صحبت نے مجھے وہ سب کچھ دیا جو ایک استاد شاگرد کو دے سکتا تھا۔''

اختر نظمی ۲۹ رنومبر ۱۹۳۱ء کو مہاراشٹر کی ایک بستی آکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کی طرف سے ان کا آبائی شہر الہ آباد تھا۔ والد کے مسلسل تبادلوں نے ملک کے کئی خطوں کے زمین و آسمان سے روشناس کرایا۔ نئی نئی ندیوں' پہاڑوں اور تہذیبوں سے بچپن کی تعمیری عمر کو سجایا بنایا۔ جوان ہوئے تو خود کی ملازمت نے امراوتی' ناگپور' بھوپال' جبلپور اور دوسری آبادیوں میں بھٹکایا۔ مشاعروں نے کشمیر سے کنیا کماری تک ہر چھوٹے بڑے شہر میں گھمایا پھرایا ہر جگہ اپنی آواز اور الفاظ کا جادو جگایا۔

وہ تحت اور ترنم دونوں میں پڑھتے تھے۔ شروع تحت سے کرتے تھے جب ماحول ہموار ہو جاتا تھا تب ترنم میں سناتے تھے۔ اور شعروں میں زبان و بیان کی صفائی' شعری زیبائی اور ترنم کی رعنائی سے مشاعروں میں چھا جاتے تھے۔ ملکی تقسیم کے بعد اردو شاعری' ہندوستان میں' فارسی

کے اثرات سے دور ہو کر ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں سے قریب ہوئی تھی۔ اس میں خیال آرائیوں اور رائج تراکیب کی جگہ اردگرد کے مناظر اور مانوس اشیاء جھلکنے لگی تھیں۔ زبان کی سطح پر بھی یہ سوچی ہوئی علامتوں اور ایبسٹریکٹ (تجریدی) پیکروں کے دائرہ سے نکل کر زمین اور زمینی مشابہتوں سے ہم رشتہ ہوئی تھی۔ اس تبدیلی نے قارئین کے مزاج کو ہی نہیں بدلا' سامعین کی سماعتوں پر بھی اثر کیا۔ اختر نظمی مشاعروں میں ان چند شاعروں میں تھے جو اپنے غیر روایتی انداز کے باوجود پسند کئے جاتے تھے اختر نظمی کا ترنم شاعرانہ تھا۔ یہ انور مرزاپوری کی طرح قوالیانہ تھا۔ نہ دل لکھنوی کی طرح آواز کے اتار چڑھاؤ کا تازیانہ تھا اور نہ فنا نظامی کی مانند محفلانہ تھا۔ اس میں جگر مرادآبادی اور ان کے بعد مجروح سلطان پوری جیسی شائستگی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا۔ جگر نیچے سروں میں تاثر جگاتے تھے اور اختر نظمی آواز کو اونچے پردوں سے اٹھاتے تھے وہ تال سر کی قواعد سے بھی واقف تھے۔

اختر نظمی گھریلو مزاج کے انسان تھے۔ لیکن گھر سے باہر کی بے اعتدالیاں' جو جوانی میں ان کے ساتھ ہو گئیں تھیں وہ بعد میں دور تک ان کے ساتھ بھی چلتی پھرتی رہیں۔ نئی نئی دلداریاں' راتوں کی سرشاریاں اور تاش کے پتوں کے ساتھ شب بیداریاں ان کی آزاد مزاجی کی علامتیں تھیں لیکن وہ کسی عالم میں بھی اپنے گھر اور اس کے آداب کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ نشہ معتدل ہونے کے بعد ہی گھر کا رخ کرتے تھے اور جانے سے پہلے منہ سے شراب کی بو کم کرنے کے لئے سونف چبانا نہیں بھولتے تھے۔ ان کی پرورش مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ اس ماحول کی اقدار تمام عمر ان کی زندگی کی معیار بندی کرتی رہیں۔ وہ بہ ظاہر گھر اور باہر میں منقسم نظر آتے تھے مگر حقیقت میں وہ ایسے نہیں تھے جیسے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے وہی اوقات جو گھر کی مصروفیات کے آڑے نہیں آتے تھے' گھر سے باہر نکل آتے تھے۔ ان کا گھر ماں کی تسبیح، بیوی کی جانماز، رحل پر رکھے قرآن اور آنگن میں کھیلتے بچوں کی مسکراہٹوں سے پرنور تھا۔ یہ گھر ان کی شاعری میں جگہ جگہ جھانکتا نظر آتا ہے۔ کہیں علامتی تہہ داری کے ساتھ کہیں جذبہ و احساس کی بردباری کے ساتھ۔

وہ جگہ تو پاک رکھنی چاہیے
جس جگہ سجدے کیا کرتے ہیں لوگ
مصوری ہے گھاؤں میں آج بھی جاری
یہ دور میرے تمہارے لیے مشینی ہے
سلسلہ زخم زخم جاری ہے
یہ زمیں دور تک ہماری ہے
ناؤ کاغذ کی چھوڑ دی میں نے
اب سمندر کی ذمہ داری ہے

اختر نظمی کتاب کے نہیں احتساب کے شاعر تھے۔ وہ علم کو مشاہدہ بنانے کے ہنر سے واقف تھے۔ وہ بنتے بگڑتے رشتوں، ٹوٹتے بکھرتے لمحوں اور ماضی وحال کی قدروں کو اپنے حواس سے پہچانتے تھے، اپنے شب وروز کے حوالوں سے جانتے تھے۔ ان کی شاعری کا مجموعی مزاج وارداتی مشاہداتی اور سوانحی تھا۔ اس میں گھر کے تقدس اور باہر کی کھلی فضاؤں کا امتزاج تھا۔ ان کی حیات میں اردو ہندی میں کئی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں شب ریزے (۱۹۸۴ء) خوابوں کا حساب (۱۹۸۶ء) سوا نیزے پر سورج ۱۹۹۶ء غزلوں کے مجموعے تھے۔ ان کے علاوہ ایک دوہوں کی کتاب 'سویا نہیں کبیر' (۱۹۹۹) میں شائع ہوئی تھی۔

ان دوہوں میں اختر نظمی اپنی گنگا جمنی تہذیب اور اس تہذیب کی جڑوں کی طرف لوٹتے نظر آتے ہیں۔ ان کا موضوعی تنوع اور لسانی مصوری، اختر نظمی کے شعری کردار کا نیا رخ پیش کرتا ہے۔ ان دوہوں کے بارے میں انہوں نے اس کتاب میں لکھا تھا۔

''ایک رات لیٹے لیٹے کبیر کا خیال آیا تو کبیر کے دوہے جو ذہن میں سوئے ہوئے تھے جاگ گئے۔ صرف جاگے ہی نہیں بلکہ پورے ماحول پر رس کی طرح برسنے لگے۔ یہیں سے میرے دوہے کہنے کی ابتدا ہوئی ہے۔''

کبیر سے اختر نظمی کا رشتہ پرانا تھا۔ ان کی ایک شروع کی غزل میں ایک شعر یوں تھا

رٹتے رہے تو یاد نہ کوئی سبق ہوا
سُن سُن کے یاد ہو گئے دوہے کبیر کے

کبیر ہندوستانی شاعری کا ایسا معجزہ تھا، جس نے ادب کے سارے قواعدی دائرے توڑ کر اپنی حیثیت منوائی تھی۔ اس نے اعلانیہ اپنے آپ کو ''اپڑھ'' کہا تھا۔ اس کے دو مصرعے اس کا ثبوت ہیں۔ تو لکھتا ہے کاگد لیکھی، میں آنکھن کی دیکھی۔ لیکن یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ اس ''اپڑھ'' نے ملک کے ایک بہت پڑھے لکھے شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو نوبل پرائز دلوا دیا تھا۔ ٹیگور کی کتاب گیتا نجلی، پر کبیر داس کے اثرات صاف طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اختر نظمی نے کبیر سے اپنی قربت کو اپنے ایک دوہے میں یوں بیان کیا ہے

دوہے برسے دیر تک جیسے برسیں تیر
میں بھی جاگا رات بھر، سویا نہیں کبیر

ان دوہوں میں عام بول چال کی زبان میں گھر، ماحول اور حالات کی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ ان میں غزل کی مشاقی کی تراش بھی ہے اور مشترک معاشرہ کی تلاش بھی ہے۔

ذات پات مت دیکھنا، جلدی کرو اُپائے
یہ بچہ بچ جائے گا خون اگر مل جائے

درزی نے ٹالا مجھے یہ کہہ کر ہر بار
کاج بٹن کی دیر ہے، کرتا ہے تیار

اختر نظمی مشاعروں کے ساتھ رسالوں میں بھی چھپتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر محمد حسن اور قمر رئیس نے ان کی کتابوں پر تعریفی دیباچے لکھے تھے۔ ابتداء میں ان کی ایک غزل نیاز فتحپوری کے ماہنامہ نگار جیسے معیاری جریدہ میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن انتقال سے چند مہینے پہلے گوالیار میں ایک رات رنجیت ہوٹل میں انہوں نے کہا تھا:

''یار'' کتابیں، شہرت، تعریفیں سب اپنی جگہ، مگر ایک قاری کی معروضی نظر سے جب اپنی شاعری کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے، جیسی یہ ہونی چاہیے تھی ویسی نہیں ہو پائی۔ کہنے کا سلیقہ اب آیا ہے تو عمر کی ڈور ہاتھوں سے چھوٹ رہی ہے''۔

اختر نظمی انتقال سے کئی ماہ پہلے سے بیمار چل رہے تھے۔ بھوپال میں اتوارہ کے چوراہے والے نوجوان کے رنگ روپ اور جسم کو وقت نے کافی بدل دیا تھا۔

ان کے سفر کا آخری پڑاؤ گوالیار میں کملا راجہ گرلس کالج تھا، جہاں سے وہ ۱۹۹۲ء میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ نے انہیں لکھنے پڑھنے کی فرصتیں کم دیں، بیماریوں کی زحمتیں زیادہ دیں۔ اور اپنے پختہ شعور کے ساتھ جس طرح وہ لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، اس کی تکمیل کی مہلت بھی زندگی نے انہیں نہیں دی۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
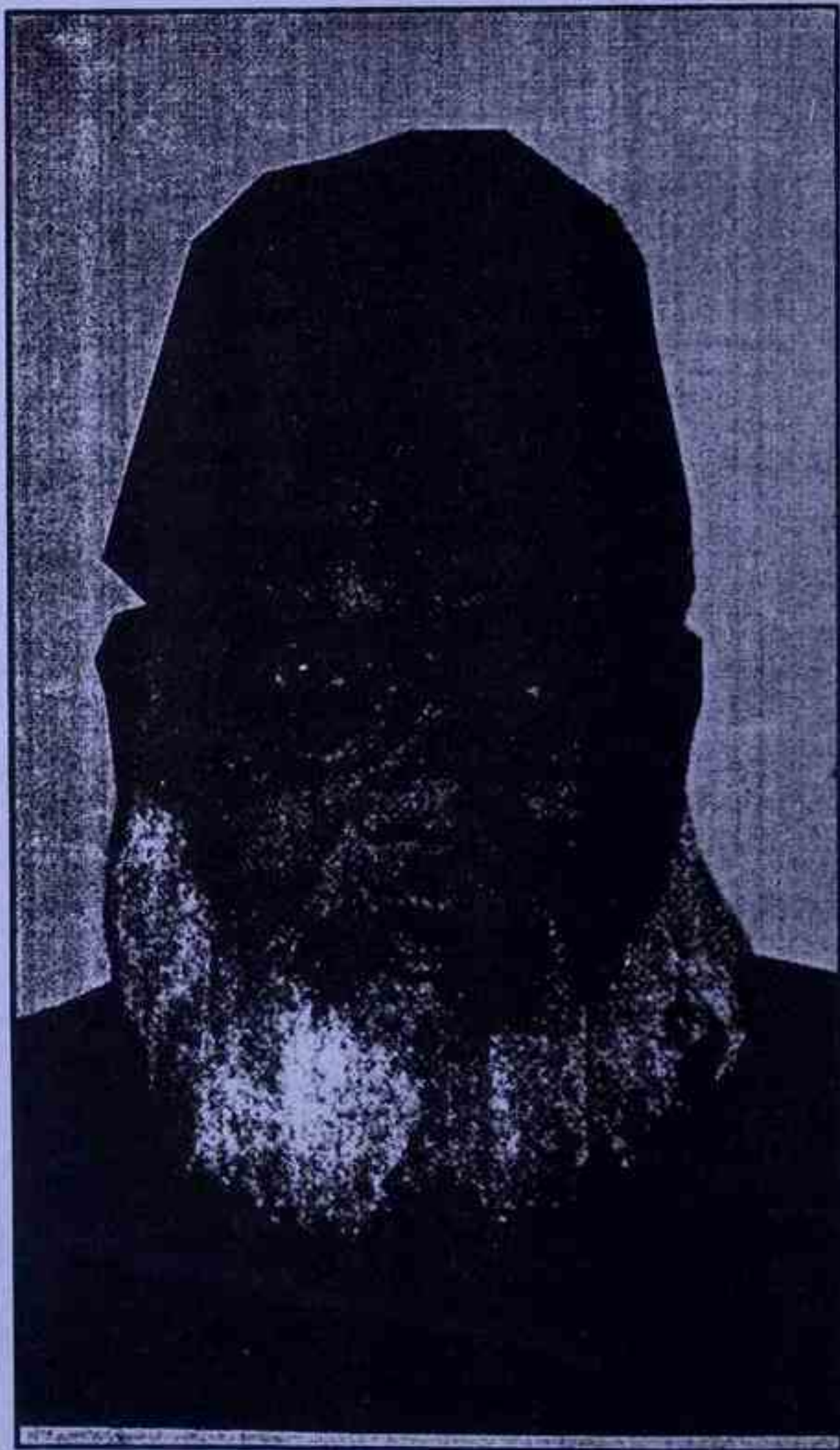
راز الہ آبادی

راز الہ آبادی

رات کو گریڈیہہ (بہار) میں مشاعرہ تھا۔ صبح سارے شعراء قریب کے اسٹیشن تک پہونچنے کے لئے اپنی اپنی بسوں کا انتظار کر رہے تھے۔ چھوٹی بستیوں میں چوپائے اور دوپائے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ رستہ چلتے ہوئے کبھی کبھی جانور بھی آپس میں لڑتے ہیں اور انسان بھی جھگڑتے ہیں۔ ایسے وقت میں، لڑنے والے تماشہ کرتے ہیں اور سارے لوگ اپنے کاموں کو چھوڑ کر تماشائی بن جاتے ہیں۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہاں سے مشکل سے دس قدم دور اچانک دھول کا ایک بڑا سا غبار اٹھا۔ غبار کے اندر کیا ہو رہا تھا یہ تو نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن کچھ بنا لفظوں کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں۔ ہوں ہوں، ڈھشم ڈھشم، دھم دھڑام۔ کچھ دیر بعد غبار بیٹھا تو دو ہانپتے ہوئے چہرے دکھائی دیئے۔ ایک پسینہ میں شرابور نور اندوری تھے اور دوسرے راز الہ آبادی۔ راز، نور کے سینے پر سوار ہاتوں سے کرتب دکھا رہے تھے۔ اور ہونٹوں سے لعن طعن فرما رہے تھے۔ دونوں مترنم اور مشاعروں کے کامیاب شاعر تھے۔ اس وقت دونوں کی ہاتھا پائی کی وجہ ایک دوسرے کی شاعری پر کڑی تنقید تھی۔ ایک کہہ رہا تھا تو شاعر و اہر نہیں ہے۔ آواز کی روٹی کھا رہا ہے، دوسرا پہلے کی شعری ناواقفیت کا مذاق اُڑا رہا تھا اور طمانچے لگا رہا تھا۔

مشاعروں کی رات بھر کی جگار کو بہلانے کے سب کے الگ الگ طریقے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی ذہنی سطحوں کے مطابق یہ بہلادے نئے نئے گل کھلاتے ہیں۔ کچھ لوگ فی البدیہہ شعر فرماتے ہیں اور ان شعروں میں نئے پرانے شاعروں کو نشانہ بناتے ہیں۔ کمار پاشی کے نئے شعری

مجموعہ ''خواب تماشہ'' پر ایک صاحب اپنی مشاقی کا یوں ہنر دکھاتے ہیں:

دہلی میں کوئی خواب تماشہ دکھائے ہے
آبِ رواں پہ رکھ کے بتاشہ دکھائے ہے

دوسرے شاعر 'تحریک' کے مشہور مدیر اور شاعر گوپال متل پر یوں حاشیہ چڑھاتے ہیں اور سب کو ہنساتے ہیں۔

اشک غم سے کیسی دلدل ہوگئی
زندگی گوپال متل ہوگئی

ایک شاعر کا شوق عجیب تھا۔ وہ جب مشاعرہ گاہ سے واپس آتے تھے تو کسی شاعرہ کا سینڈل یا کسی شاعر کی بیاض اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اور روانگی تک شاعرہ یا شاعر کی پریشانی سے لطف اٹھاتے تھے۔ ایک دفعہ حیدر آباد کے ایک مشاعرہ میں اسی طرح جون ایلیا کی ڈائری غائب ہوگئی تھی جو کئی مہینوں بعد امیر آغا کے گھر سے دستیاب ہوئی۔

راز الہ آبادی اور نور اندوری کی دھینگا مشتی، مشاعرہ کے بعد کی ایسی ہی ایک جھانکی تھی۔ دل لکھنوی کی مشاعروں میں آمد کے بعد جن شاعروں کی خوش گلوئی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت تصور کی جاتی تھی ان میں ایک مشہور نام راز الہ آبادی کا بھی تھا۔ کھنکتی ہوئی تیز تیکھی آواز، لفظوں کو گھنگروؤں کی طرح ایک دوسرے سے پروتی ہوئی جب مصرع کے اختتام تک پہنچتی تھی تو پورا ہال کھنکھنا اٹھتا تھا۔ اور جب اسی طرح پازیب کی طرح بجتا ہوا پورا شعر مکمل ہوتا تھا تو سارا مشاعرہ جگمگا اٹھتا تھا۔ آواز کا حسن لفظوں پر سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا تھا۔ شعر کیسے بھی ہوں، وہ جب تک سناتے تھے۔ ہنگامہ مچاتے تھے۔ ان کی آواز خدا کی کرامت تھی جو قارئین کی ذہانت سے زیادہ سامعین کی سماعت پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں قوالوں اور طوائفوں میں زیادہ مقبول تھیں۔ ملک کے کئی مشہور موسیقاروں نے ان کے کلام کو اپنے ریکارڈوں میں شامل کیا ہے۔ راز مشاعروں کے نہایت مقبول شاعر تھے۔ مشاعرہ ذریعہ معاش بن گیا تھا اس لئے

ان کی شعر گوئی بھی مشاعرہ کے معیار کا اعتبار تھی۔ سیدھے صاف، بنا ذہن پر زور دیئے سمجھ میں آنے والے اشعار کہتے تھے اور اپنے دائرہ میں محفوظ رہتے تھے۔

شعلۂ عشق نے معراج وفا پائی ہے
شمع کی گود میں پروانوں کی نیند آئی ہے

غمِ حیات نے اتنا مجھے سنبھال دیا
کسی نے دل بھی دکھایا تو ہنس کے ٹال دیا

اب تو دل نہیں لگتا ان پری جمالوں میں
ہم الجھ گئے کتنا آپ کے خیالوں میں

ہم کو چھیڑو نہ کبھی عالم تنہائی میں
ہم تو لٹ جائینگے بس ایک ہی انگڑائی میں

راز، صابر علی شاہ کے نام سے الہ آباد کے ایک محلہ بہادر گنج میں ۱۹۳۰ء میں ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مدرسہ میں ہوئی۔ الہ آباد کے بزرگوں کی صحبتوں سے فیض اٹھایا اور شعر گوئی کو آواز کے سہارے پیشہ بنایا۔ اپنے دور کے کئی مقامی اساتذہ کو کلام دکھایا۔ آخر میں حضرتِ نوح ناروی کی شاگردی کا اعلان فرمایا۔ نوح کے شاگردوں کی تعداد برصغیر میں دو ہزار سے کم نہیں تھی۔ راز ان کے آخری اور سب سے کم عمر شاگرد تھے۔ یہ جن دنوں نوح کے شاگرد ہوئے وہ اس وقت ثقلِ سماعت اور ضعفِ بصارت کا شکار ہو چکے تھے۔ خود راز کے کلام سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ استادی شاگردی کا رشتہ ابتدائی چند غزلوں کی اصلاح سے آگے نہیں بڑھا ہوگا۔ لیکن کلامِ استاد کی صفائی اور زبان کی ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتی رہی۔ سلیس ابھرے الفاظ اور شوخی آمیز انداز اور آواز، مشاعروں کی ضرورت بھی تھی اور استاد کی روایت بھی تھی۔

مقابلتاً چھوٹی ٹانگوں پر بھاری بھر کم دھڑ، اور اس پر فٹ بال جیسا گول سے چہرہ ہوتا کا سر، گاؤ تکیے کے غلاف کی طرح بدن پر کسی ہوئی شیروانی، ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ جو کمر پر اٹکا

اونچا نیچا ہوتا رہتا تھا۔ جوانی میں شیو کرتے تھے۔ بعد میں چہرہ پر داڑھی بڑھالی تھی اور سر پر پرانی وضع کی ٹوپی چڑھالی تھی۔ جسم سے پہلوان، چہرے سے صاحب ایمان اور آواز سے طوفان لگتے تھے۔ آواز کی حفاظت کے لئے نئے نئے طریقے استعمال کرتے تھے۔ دن میں کئی بار نمک کے پانی کے غرارے کرتے تھے۔ غراروں کے بعد کچھ گھڑیوں کو بستر پر خاموش لیٹ جاتے تھے۔ ان اوقات میں ہر سوال کا جواب ہاتھوں کے اشاروں سے دیتے تھے یا صرف آنکھوں سے مسکراتے تھے۔ دن میں کئی کئی بار دوائیاں نوش فرماتے تھے۔ جہاں جاتے تھے اپنے لئے کھانا الگ سے بنواتے تھے۔ اس میں زیادہ تر موسمی ترکاریاں ہوتی تھیں جن کو کالی مرچ، لونگ اور پیاز لہسن کی ایک متعین مقدار کے ساتھ پکایا جاتا تھا۔ اگر کھانے میں ان کے بتائے ہوئے تناسبات پر عمل نہیں کیا جاتا تھا تو سارا کھانا بنا کھائے واپس کر دیا جاتا تھا۔ اور میزبان کی خجالت کا باعث بنتا تھا۔

مشاعروں سے پہلے، راز اپنی آواز کے جادو کو رمضان میں روزہ داروں کو سحری کے لئے جگانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ہر روز، وہ سحری کے وقت، محلے کے تین چار نوجوانوں کے ساتھ، مشہور فلمی دھنوں میں، ماہ رمضان کی تقدیس اور روزوں کی اہمیت کے نئے الفاظ بھر کر گاتے تھے۔ نخشب جارچوی کی مشہور قوالی ''آہیں نہ بھری شکوے نہ کئے'' کی طرز پر ایک گیت یوں لکھا گیا تھا،

روزہ کے لئے، سحری کے لئے، ہم تم کو جگانے آئے ہیں
ہم دین کی روشن شمعوں سے تاریکی مٹانے آئے ہیں

راز الہ آبادی کی آواز اور شاعری دین کی خدمت سے مشاعروں کی شہرت تک آئی تھی۔ مذہب ان کی شخصیت کا حصہ تھا اور مشاعرہ روزگار کا قصہ تھا۔ دین و دنیا کے امتزاج نے ان کے مزاج کو اس طرح ڈھال دیا تھا کہ وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ان بے اعتدالیوں کے شکار نہیں ہوئے جن سے ان کے بیشتر معاصرین بدنام تھے۔ وہ نہ شراب پیتے تھے نہ شرابیوں ہی کی صحبت پسند کرتے تھے۔ کوشش کر کے وہ ہر مشاعرہ میں، ان شاعروں سے دور ٹھہرتے تھے، جن کے لئے شراب اور

شاعری لازم وملزوم تھی۔ راز کا شعر سنئے اس میں ان کی بردباری اور دینداری نمایاں ہے۔

شعورِ سجدہ نہیں ہے مجھ کو تو میرے سجدوں کی لاج رکھنا
یہ سر ترے آستاں سے پہلے کسی کے آگے جھکا نہیں ہے

راز الہ آبادی نوح صاحب کے رشتے سے میرے والد دعا ڈبائیوی کے استاد بھائی تھے۔ وہ جہاں ملتے تھے مجھے بھتیجہ کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ اس رشتے کے باوجود ان سے نوک جھونک بھی جاری رہتی تھی۔ ایک مشاعرہ میں وہ اپنی مشہور غزل، پلا دیجئے، دکھا دیجئے سنا رہے تھے۔ اور حسب دستور مشاعرہ کی چھت اڑا رہے تھے۔ غزل جب اس شعر پر پہنچی۔

اک سمندر نے آواز دی
مجھ کو پانی پلا دیجئے

تو مجھے شرارت سوجھی اور میں پانی کا گلاس لے کر ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرے اس عمل سے، مشاعرہ جو راز کے ترنم میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک ایک زوردار قہقہہ میں تبدیل ہو گیا۔ راز صاحب نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف گھماتے ہوئے کہا'' بھتیجے اُردو کتابیں پڑھنے سے نہیں آتی، بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنے سے آتی ہے۔ شعر میں پیاس مجھے نہیں لگی ہے سمندر کو لگی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے غزل کو جہاں سے چھوڑا تھا، وہیں سے پھر شروع کی اور اگلا شعر جو اتنی دیر میں انہوں نے اسی زمین میں فی البدیہہ کہہ لیا تھا۔ وہ انہوں نے میری نذر کیا تھا۔ شعر یوں تھا:

یہ جو شاعر ہیں 'شب خون' کے
ان کو اردو سکھا دیجئے

یہ ان دنوں کا واقعہ تھا جب ماہنامہ شب خون میں احتشام حسین اور عمیق حنفی کے درمیان جدید وقدیم کی بحث چاروں طرف موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ اور ایسے شعر تنقیدی حاشیوں کے ساتھ چھاپے جا رہے تھے۔ جو ایک مخصوص حلقہ میں سراہے جا رہے تھے۔

گھورتا کیا ہے کمینے کتے

سونگھتا کیا ہے کمینے کتے
ایک لڑکا تھا ایک لڑکی تھی
آگے اللہ کی مرضی تھی

راز صاحب نے تیر ٹھیک نشانے پر پھینکا تھا۔ ان کے اس فی البدیہہ شعر نے، غزل میں سب سے زیادہ داد حاصل کی۔ اس شعر کے بعد وہ جیسے ہی مائک سے ہٹے، سارا مشاعرہ ایک آواز میں انہیں پھر سے بلانے کی مانگ کرنے لگا۔ وہ پھر سے آئے میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور پہلے کی طرح پھر سے چھا گئے۔ راز کو سیکڑوں مشاعروں کا تجربہ تھا۔ مشاعروں میں کامیاب ہونے کے سارے ٹوٹکوں سے وہ واقف تھے۔ انہوں نے شعر سازی سے زیادہ مشاعرہ بازی پر توجہ دی تھی اور وہ تاحیات مشاعر کے ہیرو بنے رہے۔ راز کا تعلق فراق، نزالا اور احتشام حسین کے ادبی شہر سے تھا۔ اس شہر کی ادبی فضاؤں کو انہوں نے کتابی روایتوں کے بجائے اپنی سماعتوں سے اپنایا تھا۔ اور اسی سے اپنی غزلوں کو سجایا تھا۔ ان کے دو شعری مجموعے 'دھڑکنیں' اور 'منزلیں' کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ شروع میں وہ دنیا اور دین کو ساتھ لے کر چلتے تھے۔ بعد میں صرف دین کے ہو گئے اور صرف نعت، سلام اور حمد لکھتے تھے۔ اور ضرورت مندوں کو تعویزوں سے مستفیض بھی فرماتے تھے۔

چاند انگڑائیاں لے رہا ہے، چاندنی مسکرانے لگی ہے
ایک بھولی ہوئی سی کہانی پھر مجھے یاد آنے لگی ہے
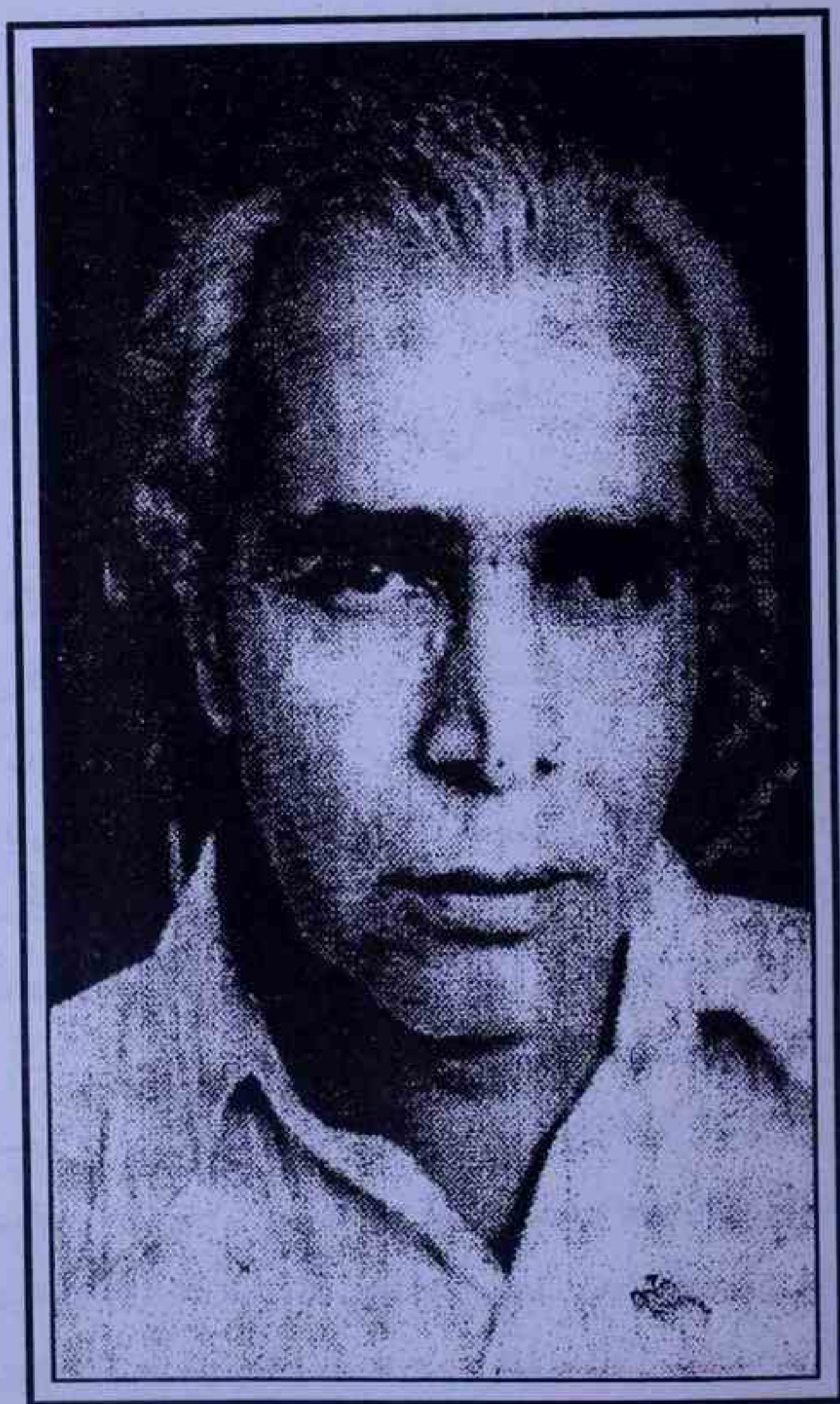
فضل تابش

فضل تابش

آج سے تیس پینتیس سال پہلے بھوپال آج جیسا یک رخا نہیں تھا۔ وہ ایک ساتھ کئی ادبی چہروں میں نظر آتا تھا۔ کہیں وہ بڑے بڑے کچے دالانوں میں حامد سعید خاں اور منیر بھوپالی جیسے بزرگوں کی طرح چوبی تختوں پر شفاف چادروں پر لگے گاؤ تکیوں سے کمر ٹکائے ادب کی تاریخ کو دہراتا تھا۔ کہیں چھوٹے بڑے چائے خانوں میں اسد، کیف، باسط بھوپالی شعری، تاج بھوپالی، عشرت قادری، ارشد صدیقی جیسی ادھیڑ عمروں کو شیروانیوں سے سجائے سیاست اور ادب کے رشتہ پر نئی نئی بحثیں جگاتا تھا اور کہیں نوجوانوں جیسا دن بھر ٹیڑھے میڑھے رستے ناپتا اور رات کو دیر تک گلوریاں چباتا تھا۔

فضل تابش بھی مظفر حنفی، اختر نظمی، وحید پرواز، قاسم نیازی، کامل بہزادی وغیرہ کے ساتھ بھوپال کی نوجوانی کے نمائندہ تھے۔ فضل تابش نوجوانوں کے اس گروپ میں اپنی وجاہت ذہانت، شرارت اور رنگارنگ طبیعت کے لحاظ سے کافی نمایاں تھے۔ منہ میں ہونٹوں کو لال کرتا پان' کلمہ کی انگلی پر چٹکی بھر چونے کا نشان' پٹھانی آن بان اور بات بات پر دیر تک گونجتے قہقہوں کی اڑان ان کی پہچان تھی۔

فضل تابش بہت ہنستے تھے۔ اپنے ہم عمروں میں ان کے پاس سب سے زیادہ ہنسی تھی۔ جسے وہ جی کھول کر خرچ کرتے تھے۔ کسی شناسا کی پریشانی یا کسی اجنبی چہرہ کی تابانی کے

علاوہ ان کے لئے ہر بات ہر واقعہ قہقہہ بردوش تھی۔ اس وقت ان کا قہقہہ تاج کی غزل شعری کے ترنم اور کیف کے پھکڑپن کی مانند بھوپال میں مشہور تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ اس وقت، شعری اور کیف مشاعروں کے کارن بھوپال سے باہر بھی جانے جاتے تھے اور فضل تابش کے قہقہے ابھی صرف تالابوں کے اردگرد ہی پہنچانے جاتے تھے۔ مسلسل ہنسنے کی ورزش نے فضل تابش کے چہرہ کی شادابی میں اضافہ کیا تھا۔ ان دنوں کا ان کا ایک مطلع ہے۔

نہ کرشمار کہ ہر شے گنی نہیں جاتی
یہ زندگی ہے حسابوں سے جی نہیں جاتی

تقریباً تین صدی پہلے کا واقعہ ہے۔ گونڈوں کی ایک رانی کملاپتی تھیں۔ وہ ایک بہادر افغان فوجی کے حسن اور بہادری پر مہربان ہوگئیں۔ اور آدی باسیوں کی ایک ہری بھری وادی بھوج پال، سردار دوست محمد خاں کو بخش دی۔ خوبصورت تالابوں اور پہاڑیوں سے گھرا یہ علاقہ بعد میں بھوپال کے نام سے نوابی ریاست بنا۔ دوست یار خاں کا اپنا جرگہ تھا۔ اس جرگہ میں اکثریت نے مقامی رشتوں کے ذریعہ یہاں کے موسموں کے رنگوں سے ناتا جوڑا اور ان میں سے کچھ نے اپنی شباہت اور خارجی جسامت کے دائرہ کو نہیں توڑا۔ فضل تابش اس جرگہ کے محفوظ دائرہ سے ہم رشتہ تھے۔ جو کئی نسلوں کے بعد بھی اپنے اپنے اجداد کی وراثت کی ضمانت تھے۔

غالبؔ نے بڑھاپے میں اپنی جوانی کے حسن کے گن گائے تھے۔ لیکن ان کے حسن کے بارے میں سب نے ان کے خطوں کے مجموعے میں پڑھا تھا۔ فضل تابشؔ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی شخصیت میں کابل کے سیبوں کی رعنائیوں اور وہاں کے برف پوش پربتوں کی اونچائیوں کا مناسب امتزاج تھا۔ شادی سے پہلے وہ بہت سی آنکھوں کے سپنے تھے لیکن شادی کے بعد صرف طاہرہ خاں کے اپنے تھے۔ طاہرہ ان کی اہلیہ کا نام تھا جو ایک مقامی اسکول میں استانی تھی۔ فضل نے اپنے مزاج کی اس تبدیلی کا اظہار اپنی ایک غزل کے شعر میں کیا ہے۔

پھر ہم نے اک پیار کیا پھر وہی ہوا
وہ دلبر بھی طاہرہ خاں سے ہار گیا

فضل تابش بھوپال کے اہم جدید شاعر تھے۔ لیکن ان کی جدیدیت' دوسرے علاقوں کی مانند کائنات میں وجود کی تنہائی کی ماتم گسار نہیں تھی۔ فرد اور سماج کے رشتہ کا اقرار بھی تھی۔ وہ ہندی کے کوی مکتی بودھ اور اردو کے اختر الایمان کی طرح زندگی کے تضادات کو معاشرہ کے آئینہ میں دیکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا مزاج مسائلی اور لب ولہجہ قبائلی تھا۔ ان کی شعری زبان جو بظاہر کھردری نظر آتی ہے۔ کبھی روایتی تکلفات سے آزاد ہو کر ماضی کے چہرہ سے پردہ اٹھاتی ہے' کبھی حالات کی کشمکش کو گلیوں چوراہوں کا آئینہ بناتی ہے۔ وہ ایک ناراض ذہن کے شاعر تھے۔ لیکن اُن کی ناراضگی وجود کی بے معنویت کے بجائے زندگی سے محبت کی عتیدت تھی ان کی شاعری خیر وشر کی لڑائی میں فعال شرکت کا بیان ہے۔ وہ اشتراکی مسلک کے جدید شاعر تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "روشنی کس جگہ سے کالی ہے" کے نام سے ۱۹۹۴ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ مجموعہ کا نام انہوں نے اپنے ہی ایک شعر کے ایک مصرع سے لیا تھا۔ یہ شعر ان کے شعری کردار کا معیار بھی ہے۔

ریشہ ریشہ ادھیڑ کر دیکھیں
روشنی کس جگہ سے کالی ہے

فضل تابش پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۳۳ء بھوپال کے ایک پرانے خاندان کے چراغ تھے۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا اور گھر سے باہر جن کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا وہ لامذہب کمیونسٹ تھے۔ لیکن بھوپال کی جدیدیت کی مانند یہاں کی اشتراکیت بھی دوسری جگہوں سے مختلف تھی۔ بھوپال کے مقبول کمیونسٹ رہنما کامریڈ شاکر علی خاں تھے۔ ان کے کمیونزم نے مارکسی تعلیمات میں دینیات کی گنجائشیں نکالی تھیں۔ وہ پانچوں وقت مسجد میں خدا کے حضور میں سر جھکاتے تھے اور نمازوں کے وقفوں میں حکومت وقت کے خلاف سرخ پرچم اٹھاتے تھے۔ اور مزدور کسانوں کی بدحالی پر تبصرہ فرماتے تھے۔

فضل تابش کی نظریاتی وابستگی بھی اسی علاقائی ماحول اور بھوپالی اشتراکیت کی دین تھی۔ ان کی اشتراکیت ملحدانہ نہیں تھی دین دارانہ تھی۔ ان کے مجموعے کی پہلی نظم ''دعا'' کے ابتدائی مصرعے یوں ہیں۔

یہ دنیا خوبصورت ہے۔
ہمیں جینے کی نعمت بخش کر
زندہ دلوں کے ساتھ رہنے کی سعادت دی
ہمیں مکار و عدو اں
بے سروپا چھوٹے پیمانوں میں واضع فرق کرنے
اور بچنے کا ہنر بخشا
خدایا شکریہ تیرا

فیض کی بھی ایک نظم دعا کے عنوان سے ہے۔

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں

ان نظموں میں الحاد اور یقین کا جو فرق ہے وہی بھوپال کی اشتراکیت کی شناخت ہے۔ فضل تابش کے ساتھ زندگی کا سلوک ابتدا میں کچھ اچھا نہیں رہا۔ ابھی وہ مشکل سے میٹرک کر پائے تھے کہ اچانک سارا گھر بوجھ بن کر ان کے تنہا کندھوں پر سوار ہو گیا۔ گھر میں سب سے بڑا ہونے کی سزا قبول کی۔ اور ان کو اپنی تعلیم روک کے ایک دفتر میں کلرکی کرنی پڑی۔ مسلسل پندرہ برس گھریلو ذمہ داریوں میں صرف ہوئے بعد میں اردو میں فرسٹ کلاس میں ایم اے کے مقامی حمیدیہ کالج میں لیکچر ر ہو گئے۔

زندگی کی اس طویل تگ و دو میں ادب بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ان کی ادبی پہچان صرف شاعری تک محدود نہیں ہے۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے افسانہ نگاری بھی کی ہے۔

ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ سوانحی ناول بھی تحریر کیا ہے۔ ان کے دو ناٹک دیوناگری میں وانی پرکاشن سے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں ان کے علاوہ فریدالدین عطار کی مثنوی کا اردو ڈرامائی روپ بھی ان کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ڈرامہ بھوپال میں بھارت بھون میں کئی بار اسٹیج کیا جا چکا ہے۔ وہ اچھے مترجم اور اسٹیج اور فلم کے اداکار بھی تھے۔ دوردرشن کی ٹیلی فلم اردو ہے جس کا نام ''منی کول کی تجرباتی فلم ''سطح سے اٹھتا آدمی'' کمار ساہنی کی فلم خیال گاتھا جیسی فلموں میں ان کی اداکاری کو کافی سراہا گیا تھا۔ لیکن ان کی ادب دوستی اور بھوپال پسندی نے اداکاری کو پیشہ نہیں بننے دیا۔

فضل تابش زندگی کے کئی رنگوں کے پرستار تھے۔ ان کی فنکارانہ بے چینی نے اپنے اظہار کے کئی پیرائے تلاش کر لئے تھے۔ دوسروں کی خوشیوں میں شرکت کی مہلت تو انہیں مشکل سے ملتی تھی لیکن جان پہچان کے دکھ درد میں وہ ضرور شامل رہتے تھے۔ ان کی آمدنی میں بھی ان کی شخصیت کی طرح بہت سوں کی حصہ داری تھی۔ اپنے گھریلو اخراجات کے ساتھ اس میں تاج بھوپالی کی شراب بھی تھی۔ مقصود عمرانی کی بیٹی شہناز کی کالج کی پڑھائی بھی تھی' رات میں یار دوستوں کی خاطر مدارات بھی تھی۔ پارٹی اور دیگر سماجی اجلاس کے لئے چندہ بھی تھا۔ فضل تابش نے خوب کمایا۔ مگر جتنا کمایا اسے بھی اپنے قہقہوں کی طرح رات دن لٹایا۔ ان کی آمدنی پر صرف انہیں کا حق نہیں تھا اس میں اور کئی ضرورت مندوں کی ساجھے داری تھی۔ ان کا گھر بھوپال میں اقبال چوک کے سامنے جہاں مشہور آرٹسٹ سوامی ناتھن کا بنایا ہوا اقبالؔ کا آہنی شاہین نصب ہے شیش محل کی اوپری منزل میں تھا۔ نوابی عہد میں یہ عمارت کئی پہروں کی حراست میں تھی۔ جب سے یہ عمارت تابش کی رہائش گاہ بنی، اس پر شہر بھر کے ادیبوں، شاعروں کی آزاد بادشاہت تھی۔ ان کا گھر کنڈی تالے کی فرسودہ روایت سے آزاد تھا۔ وہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ فضل تابش گھر میں ہوں یا نہ ہوں طاہرہ بھابی ہوں یا نہ ہوں ان کے بچے ہوں یا نہ ہوں۔ ان کے دوستوں میں کوئی بھی کسی وقت بھی اس میں بنا روک ٹوک جا سکتا تھا۔ باورچی خانے میں جا کر کھانا کھا سکتا تھا۔ چائے بنا سکتا تھا۔ کھاٹ پہ آرام فرما سکتا تھا اور فریش ہو کے واپس جا سکتا تھا۔ اس بنا میزبان کی

مہمان نوازی سے میں بھی کئی بار فیضیاب ہو چکا ہوں۔ فضل تابش اپنے قہقہوں کی طرح بڑی کشاد گیوں کے انسان تھے۔

فضل مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ ان کی ترجیحات کی فہرست مشاعرہ سے خالی تھی۔ لیکن اخلاقی مجبوری کو بھی ضروری بنا لیتے تھے۔ ہاں نشستوں میں جم کر سناتے تھے۔ آواز بھاری اور پر اثر تھی۔ تحت میں پڑھتے تھے۔ جب مائک پر آتے تھے تو آواز سے کم چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے عوام کو لبھاتے تھے اور نئی لفظیات اور تیکھے گہرے طنز اور سماجی شعور کی بنا پر خواص پر چھاتے تھے۔ کیسا ہی مجمع ہوا سے بس میں کرنا انہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مشاعروں کے پیشہ ورانہ میلان کو وہ سنجیدہ ادب کے لئے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ ان کی زبان اردو کی روایت اور ہندی نئی شاعری کی حرارت کا ایسا ملاپ تھا جو جدت پسندوں کو تو بھاتی تھی لیکن قدامت پسندوں کو چونکاتی تھی۔ اس میں استعارے، علامتیں اور لفظیات دوسروں سے بڑی حد تک مختلف تھیں۔

برگد نے اپنے بال نہ کٹوائے آج تک
ہر چند اس کی عمر کٹی آدمی کے ساتھ
وہ کہہ رہے ہیں روایت کا احترام کرو
میں اپنی لاش کی بدبو سے بھاگا پھرتا ہوں
سحر پھیلا رہی ہے اپنے بازو : میرا سایہ سمٹتا جا رہا ہے
اب یہ چہرہ کیا ہے بیتے یگ کا ادھڑا رستہ ہے :
میرا ماضی یہ چہرے ہیں ' میرے بچوں سے ملیے ۔

فضل تابش، شعری، کیف، اختر سعید، اور تاج کے بعد کی نئی نسل کے شاعر تھے۔ وہ بھوپال کی ریاستی تہذیب اور اسکی اقدار کے پرستار تھے۔ یاروں کے یار تھے۔ تنہائی میں عبادت گذار تھے، محفل میں مے خوار تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری قہقہہ اپنے گھر، شیش محل میں دوستوں کی محفل میں لگایا تھا، اس رات وہ اتنے ہنسے تھے کہ دوسرے دن ان کے پاس ہنسنے کو کوئی اور قہقہہ نہیں بچا تھا۔ اس لئے خاموش ہو گئے تھے۔ فضل تابش کے مجموعے کے سال اشاعت اور

انکا سال رحلت ایک ہی ہے

سنو ہم درختوں سے پھل توڑتے وقت
ان کے لئے ماتمی دھن بجاتے نہیں
سنو پیار کے قہقہوں والے معصوم لمحوں میں ہم
آنسوؤں کے دیوں کو جلاتے نہیں

فضل تابش بھوپال کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھے۔ ان کی شخصیت، ہندی اردو کی ادبی اقدار کا سنگم تھی۔ ان کے ماتم گساروں میں اردو ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ، ہندی کے کوی اور لیکھک بھی شامل ہیں۔
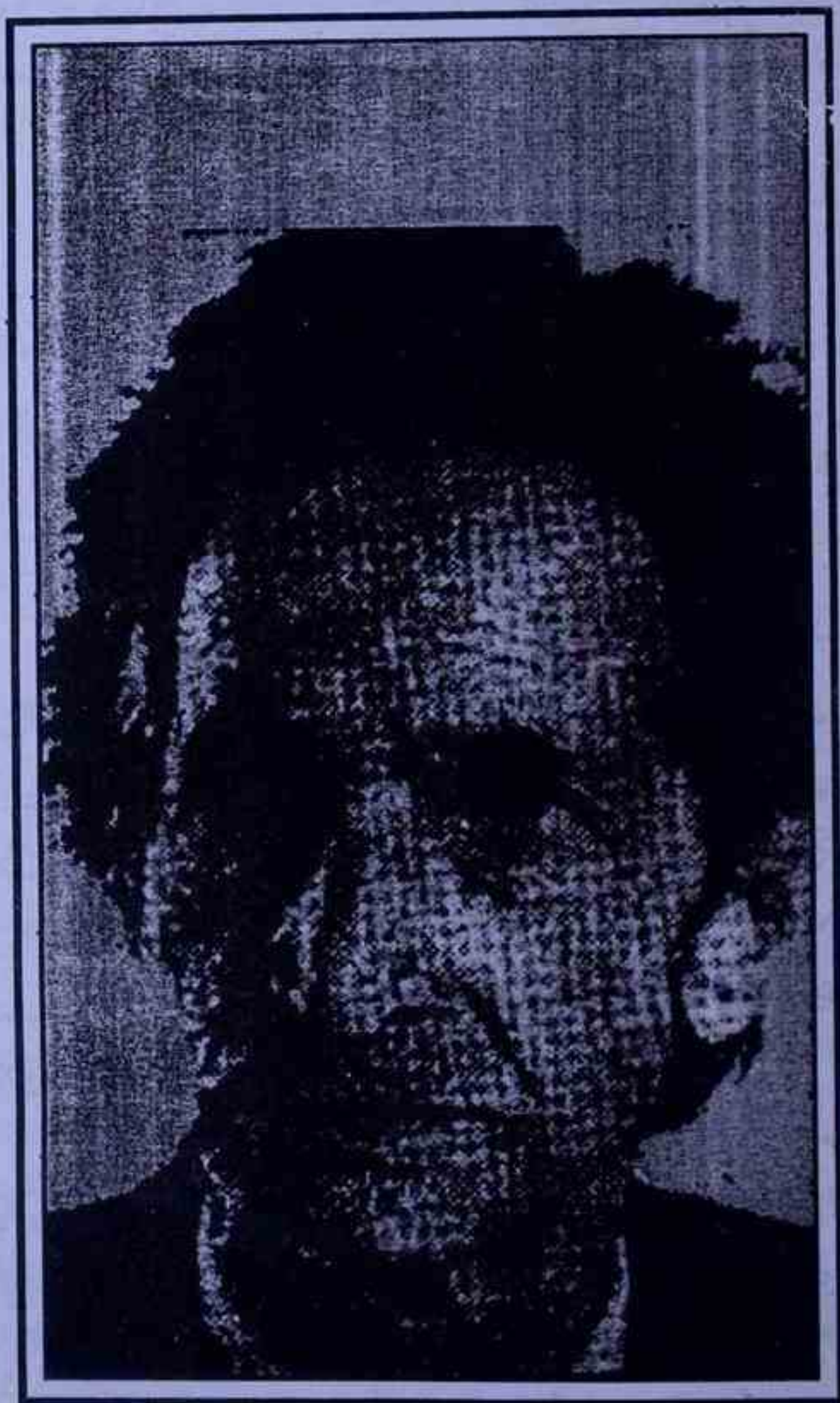
کرشن ادیب

کرشن ادیب

کئی سال پہلے کی بات ہے لدھیانہ میں مشاعرہ تھا۔ لدھیانہ پنجاب میں تھا اور سارا پنجاب گولی، تلوار اور بموں کے دھماکوں سے پر شور تھا۔ جگہ جگہ بندوق دھاری فوجی نظر آتے تھے۔ سارے علاقہ میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ عقل کہتی تھی نہیں جاؤ، پیٹ کہتا تھا ہو کر آؤ۔ پیٹ کی نصیحت پر عمل کیا، ہاتھ میں صندوق لیا اور چل دیا۔ جدید سائنس کہتی ہے انسان کے دو دماغ ہوتے ہیں۔ ایک سر میں ہوتا ہے دوسرا پیٹ میں۔ ہندوستان کی آبادی کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ پیٹ سے ہی سوچتا ہے۔ پیٹ ہی راستہ سُجھاتا ہے یہ ہی رشتے بناتا مٹاتا ہے، یہ ہی اپنی نیند سلاتا ہے، اپنی جگار جگاتا ہے۔

لدھیانہ میں ٹرین سورج طلوع ہونے سے دو گھنٹے پہلے پہونچ گئی تھی۔ علاقائی حالات کے تحت جو قانون بنایا گیا تھا اس کے مطابق سارے مقامی اور بیرونی مسافروں کو اسٹیشن میں ہی روشنی ہونے تک ٹھہرنا تھا۔ دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی مسافر خانہ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سفر کی تھکن نے آنکھوں میں غنودگی بھر دی۔ اور اس تھوڑی جھپکی میں اخباروں کی خبریں، ہتھیار بند دہشت گرد بن کر نیند بھری آنکھوں میں گھوم رہی تھیں کہ اچانک ایک زور کا دھماکہ ہوا نیند ٹوٹی تو کچھ دیر کچھ نظر نہیں آیا بعد میں معلوم ہوا جسے میں نے بے ہوشی میں دھماکہ سمجھا تھا۔ وہ ہوش میں اُکھرے بدن و چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھیں، لمبے قد اور گرم سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ایک انسان

تھا۔ لمبے قد اور ایرانی خدوخال کا تندرست نوجوان تھا۔ اس کے ہاتھ کی انگلیاں میرے کاندھے پر تھیں اور وہ اجنبی ہوتے ہوئے شناسا کی طرح مسکرا رہا تھا۔ بھاری ٹھیٹ پنجابی لہجہ میں اس نے پوچھا تم ندا فاضلی ہو؟

جی ہاں! میں نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔ اس چونکنے میں تھوڑا ڈر بھی تھا۔

اس نے میرے منہ سے جی ہاں سنتے ہی اسی آواز میں کہا ندا فاضلی ہو تو یہاں کیوں بیٹھے ہو' چلو میرے ساتھ۔ شکنتلا شری واستو (کنوینر مشاعرہ) سے مجھے معلوم ہو گیا تھا تم اسی گاڑی سے آ رہے ہو۔ اور میں جانتا تھا قانون کے مطابق تمہیں صبح تک باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ میں حضور تمہیں ہی لینے آیا ہوں۔ اس نے میری اٹیچی اٹھالی اور میں خاموشی سے اسکے پیچھے ہولیا۔ میں اس کے نام سے واقف تھا گیٹ پر ریلوے حکام نے باہر جانے سے روکا تو وہ ناراض لہجے میں ان سے کہنے لگا۔

''حضور آپ کو شاید علم نہیں' یہ شہر ساحر لدھیانوی کی نظمیں اور غزلیں سن چکا ہے۔ شو بٹا لوی کے کلام کو سراہتا رہا ہے۔ یہاں سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر جالندھر ہے' وہ حفیظ جالندھری کے گیتوں سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔ امرتا پریتم اور اجیت کور کو چاہتا ہے۔ یہ علاقہ شاعری کا پرستار ہے' اچھے شاعروں سے اسے پیار ہے۔ یہاں ندا فاضلی کو کوئی خطرہ نہیں یہ میرے ساتھ جائیں گے اور میں بدنام شاعر ہوں۔ اسی شہر کا شاید آپ جانتے ہوں''

اس مختصر سی تقریر کے بعد گیٹ کے پہرے داروں نے ہمیں باہر جانے دیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ٹیکسی لی اور کئی اندھیرے راستوں سے گذار کر مجھے صحیح سلامت ایک ہوٹل میں پہونچا دیا۔ ہوٹل کے کمرے کی روشنی میں میں نے اسے دیکھا تو وہ کچھ گھبرایا گھبرایا بے چین سا نظر آ رہا تھا۔ اس اضطراب کو بہلانے کے لئے وہ بار بار سگریٹ سلگا رہا تھا اور لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ جب گھبراہٹ بڑھنے لگی تو وہ بیٹھے بیٹھے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

یار تمہارے سورج کو نکلنے میں ابھی ایک گھنٹے کی دیر ہے اور میرا سورج کبھی کا طلوع ہو چکا ہے۔ اس لئے اب میں چلتا ہوں مجھے پچاس روپے دو شراب پینے کے لئے۔ میں پہلے خود کو

شراب پلاؤں گا' پھر تھوڑا جسم کو سلاؤں گا اس کے بعد شام کو مشاعرہ میں آؤں گا۔ اور تمہارے شعر سنوں گا اور اپنے سناؤں گا۔ تمہاری گاڑی کے انتظار میں ساری شراب اتر گئی۔

اس کی بے تکلفی مجھے پسند آئی میں نے فوراً اسے سو کا نوٹ دیا۔ وہ نوٹ لے کر تیز قدموں سے گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر پچاس روپے لوٹا گیا۔

کرشن ادیب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد لدھیانہ میں اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر بار شراب کی طلب اسے میرے پاس لاتی تھی اور معاوضہ لے کر چلی جاتی تھی۔ اس سے آخری ملاقات بھی لدھیانہ میں ہی ہوئی تھی۔ وہ حسب دستور میرے وہاں پہونچتے ہی مجھ سے ملنے آ گیا تھا۔ لیکن اس بار وہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ گالوں میں گڑھے پڑ چکے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ لگ چکا تھا۔ کمر جھک چکی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا لگ رہا تھا۔ میں نے اس کے آتے ہی پہلے کی طرح پیسے نکال کر اسے دینا چاہے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ ''میں نے شراب چھوڑ دی ہے' اب تمہیں اس عنایت کی زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اسکی بات سن کر مذاقاً کہا۔

یار کرشن ادیب' جب تمہارے جسم میں شراب کے بگاڑنے کو بہت کچھ تھا' پھیپھڑے تھے' کلیجہ تھا' دل تھا' بدن پر گوشت تھا آواز تھی' بینائی تھی' تب تو تم رات دن پیتے رہے اب تو ان میں سے کچھ بھی نہیں رہا اب شراب تمہارا کیا بگاڑ لے گی جو اسے چھوڑ رہے ہو۔ میرے مذاق پر اس نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ اس قہقہہ میں ہنسی کم تھی آنسو زیادہ تھے۔ اس کی ایک غزل کے شعر ہیں:

سرپھری پاگل ہوا کا تیز جھونکا آئے گا
حسرتوں کے خشک پتوں کو اڑا لے جائے گا

دودھیا آکاش میں کس کو صدا دیتا ہے تو
تیرے ماضی کا پرندہ اب نہ واپس آئے گا

خواہشوں کے جنگلوں میں لذتوں کے پیڑ ہیں
ان کے سائے میں جو آئے گا بہت پچھتائے گا

ہندوستان کے پنجاب میں لبھورام جوش لالہ امر چند قیسؔ، پورن سنگھ ہنرؔ، میلا رام وفاؔ وغیرہ کے بعد جو شعراء کی نسل ابھری تھی اس میں نریش کمار شادؔ، پریم وار برٹنیؔ اور کرشن ادیب زیادہ نمایاں تھے۔ ان کا تعلق مشاعروں کے ساتھ رسائل اور کتابوں سے بھی تھا۔ شاعر تو ان کے ساتھ اور بھی تھے ان میں کچھ تو اب بھی تخلیقی لحاظ سے سرگرم ہیں جیسے پرتپال سنگھ بیتاب، پریم کمار نظرؔ، جگر جالندھریؔ آزاد گلاٹھی کرشن کمار طور وغیرہ مگر ان تینوں، نریش کمار شاد، پریم وار برٹنی اور کرشن ادیب میں جو مشترک قدر تھی وہ ان کا بوہیمین رویہ تھا۔ نریش کمار شادؔ دہلی میں جمنا ندی میں نشے کی حالت میں اپنی ہی پرچھائیں سے باتیں کرتے ہوئے جمنا کے حوالے ہو گئے۔ پریم وار برٹنیؔ مالیر کوٹلہ کی پرانی عمارتوں اور گلیوں نما بازاروں کو اپنی بلا نوشی کا افسانہ سناتے ہوئے خود فسانہ بن گئے۔ کرشن ادیبؔ ان دونوں سے سخت جان تھے۔ وہ ۷۲ سال تک مسلسل زندگی کو ڈھوتے رہے۔ ستر سال پورے ہونے پر وزیر آغا نے اوراق میں ان کا ایک گوشہ بھی نکالا تھا۔ اس میں ان کی شاعری اور شخصیت پر بلراج کومل حامدی کاشمیری' آزاد گلاٹھی' وزیر آغا نے لکھا تھا۔ اس گوشہ میں خود کرشن ادیبؔ نے بھی اپنا ایک مختصر سا سوانحی خاکہ تحریر کیا تھا۔ اپنے بارے میں ان کی رائے یوں ہے۔

''ستر سالہ زندگی کا سفر ایک طویل داستان ہے۔ بچپن نامرادانہ گزرا' جوانی شاعرانہ بیتی اگر چہ والد اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے لیکن مجھے تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی۔ امتحانات کی رپورٹ آتی جس میں لکھا ہوتا کہ سوائے اردو کے تمام مضامین میں فیل ہے۔ گھر میں اسٹالن کی شکل کے مونچھوں والے والد کی مار اور اسکول میں اساتذہ کی پھٹکار مجھے ہر وقت خوف زدہ رکھتی تھی''

وزیر آغا نے اس کے بارے میں لکھا۔ ''کرشن ادیبؔ تمام عمر اپنے اندر کے عفریت سے برسر پیکار رہا۔ زندگی کے آخری ایام میں جب بقول غالب قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اس کے اندر کا یہ قیدی مونچھوں پر تاؤ دیتا بدن کے حصار سے باہر نکل آیا ہے اور اپنی جارحیت کا کھلم کھلا مظاہرہ کرنے لگا ہے۔

بلراج کوملؔ نے اسے مقابلۃً زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اس کی بوہیمین زندگی کے ہر پہلو سے واقف تھے۔ وہ کہتے ہیں۔

کرشن ادیب کی شخصیت اس نظم کے مانند ہے جس میں تفصیلات نہایت غلیظ ہوتی ہیں لیکن نظم مجموعی طور پر خوبصورت ہوتی ہے۔ اس کی تصویر اسی قسم کی ہے۔ کرشن ادیب آوارہ گرد ہے۔ بے کاری اس کا مستقل پیشہ ہے درجنوں لڑکیوں سے عشق کر چکا ہے۔ پہلے دوسروں کے شعر سنایا کرتا تھا۔ اب بہت سالوں سے اپنے شعر سناتا ہے۔

کرشن ادیب کی شاعری کی ابتدا سن پچاس سے ہوئی۔ اس شروعات کو اس نے اپنے ایک خط میں ایک ایسے رومانی حادثہ سے منسوب کیا ہے جس سے عمر کے ایک مخصوص دور میں سب ہی گذرتے ہیں۔ لیکن کرشن ادیب کی آوارہ مزاجی نے اسے کسی ایک رومانی حادثہ تک محدود نہیں رکھا۔ وہ مسلسل ایسے حادثوں سے بار بار دوچار ہوتا رہا' اور ہر حادثہ میں قسط وار خود کو کھوتا رہا۔ ان رومانی حادثوں کی فہرست کا آخری نام مونا تھا۔ مونا اس کی زندگی میں اس وقت آئی جب آدمی لمبے سفر کی تھکان کے بعد کسی سائے کی تلاش کرتا ہے۔ مسز ادیب نے کئی حادثوں سے ٹوٹے پھوٹے کرشن ادیب کو اپنی نرسنگ مہارت سے جوڑ جاڑ کے وقتی طور پر درست چست تو کر دیا لیکن عمارت میں مرمت دیر سے ہوئی تھی اس میں بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اس لئے جلد ہی کبھی پلستر جھڑنے لگا' کبھی دالان بگڑنے لگا۔ اور پھر پوری چلتی پھرتی بلڈنگ ایک دن ہر ہرا کر ڈھے گئی۔ کرشن ادیب کی ایک نظم کا آخری بند ہے:

اگر چہ میں اس امتیاز بہار و خزاں سے بھی ماورا ہو چکا ہوں
مگر خود سے میں پوچھتا ہوں
کہ یہ کون ہے
جس کے پاؤں میں بلبل کے نغمے کی زنجیر سی ہے
جو اب بھی کسی آنے والے حسیں موسم گل کی رہ تک رہا ہے۔

کرشن ادیب کئی شعری مجموعوں کے شاعر تھے پہلا شعری مجموعہ آج سے ۳۰ برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اس کا نام آگ کی پرچھائیاں تھا۔ مکتبۂ دین وادب سے ایک اور مجموعہ پھول پتے اور خوشبو شائع ہوا۔ دیوناگری میں بھی ایک کتاب ''شام کے بعد'' ہے ان شعری مجموعوں کے

علاوہ انہوں نے نثر میں بھی ایک کتاب ''ساحر یادوں کے آئینے میں'' لکھی۔ اس کتاب میں کرشن ادیب نے لدھیانہ میں ساحر سے اپنی قربتوں کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ اس میں ساحر اور امرتا پریتم کی دوستی کے ذکر میں ''امرتا کے گھر میں ان سگرٹوں کے ٹکڑوں کے بھی کردار ہیں جو ساحر کے چلے جانے کے بعد امرتا کے ہونٹوں سے لگ جاتے تھے اور سلگ سلگ کر انہیں ساحر کے شعر سناتے تھے۔ ان سگریٹ کے ٹکڑوں کے رومانس کے بارے میں گوپال تل نے اپنی کتاب لاہور کا جوذکر کیا میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

کرشن ادیب ان شاعروں میں تھے جو سیاست کی ملکی ولسانی تقسیم کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔ وہ اردو کے حوالے سے دونوں ملکوں کو غیر منقسم سمجھتے تھے وہ بہ یک وقت دونوں ملکوں میں ایک ساتھ رہتے تھے اُس کا جسم ہندوستان میں رہتا تھا۔ لیکن دماغ فیض ابن انشاء اور قتیل شفائی کے پاکستان میں رہتا تھا۔ کرشن کا کلام بھی افکار اوراق تخلیق اور سیپ جیسے پاکستانی رسائل میں زیادہ نظر آتا تھا۔ ملکی ولسانی تقسیم کو نہ ماننے کی ضد نشے میں اکثر شدت اختیار کر لیتی تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی مقامی سیاسی لوگوں سے ہاتھا پائی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک بار امرتسر میں شراب کی محفل میں ناراض ہو کر وہ امرتسر کراس کر کے واگھہ کی سرحد پر پہونچ گیا تھا۔ جب سرحد کے محافظوں نے اسے روکنا چاہا تو وہ نشے میں چلانے لگا۔

آپ بکواس کرتے ہیں۔ یہ تقسیم جھوٹی ہے۔ فیض اور ساحر کی شاعری نہ تقسیم ہوئی ہے نہ ہوگی۔ اے حمید اور کرشن چندر کے ناولوں کو سیاست نہیں بانٹ سکتی ہے۔ بابا نانک اور بلے شاہ ہماری سانجھی وراثت ہیں، یہ بٹوارہ محض سیاست ہے جو قابل ملامت ہے''

کرشن ادیب کی باتیں سرحد کے سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ وہ اسے پاگل سمجھ کر بند کرنا چاہتے تھے کہ اتنے میں ایک اونگھتے ہوئے سردار جاگ پڑے ان کی نظر کرشن ادیب پر پڑ گئی۔ وہ کرشن ادیب کو اس کے نام سے بھی جانتے تھے اور صورت سے بھی پہچانتے تھے۔ اس نے اٹھ کر نہ صرف کرشن کو سپاہیوں سے چھڑایا سرحد پار کے اپنے ہم رتبہ کپتان کو بھی وائرلیس سے بتایا کہ ایک اردو کا شاعر کرشن ادیب اس وقت ہمارے پاس ہے۔ وہ میرے تمہارے دو ملکوں کے

درمیان کسی سرحد کو نہیں مانتا۔آپ کا کیا خیال ہے اسے آپ کی طرف آنے دیں۔وہ احمد ندیم قاسمی اور حبیب جالب سے ملنا چاہتا ہے"۔سرحد پار کے کپتان نے بلند قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"بات تو آپ کا شاعر صحیح کہتا ہے سردار جی۔لیکن ہر سچائی سیاست کے کام کی نہیں ہوتی۔اسے سردار جعفری کا مصرعہ سنا کر واپس اس کے گھر بھیج دیجئے۔سچ بات آج کل نشہ میں ہی کی جاتی ہے۔

میں اس سرحد پر کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

کرشن ادیب کی شاعری شخصی رومان اور اجتماعی ہیجاں سے عبارت ہے وہ ساحر کی دوستی میں ترقی پسند بن تو گیا تھا لیکن اپنے مزاج اور انداز سے وہ قتیل، عدم، ندیم، فیض اور ساحر کی رومانی شاعری کی عاشقانہ شاخ پر ہی اپنا شعری آشیانہ تعمیر کرتا نظر آتا ہے۔وہ ایک سیکولر مزاج کا غیر منقسم ہندوستاں کا اردو کا شاعر تھا۔

جب بھی آتی ہے تری یاد کبھی شام کے بعد
اور بڑھ جاتی ہے افسردہ دلی شام کے بعد
یوں تو ہر لمحہ تری یاد میں بوجھل گذرا
دل کو محسوس ہوئی تیری کمی شام کے بعد
مئے گل رنگ سے روشن کرو تاروں کے چراغ
ورنہ ڈس جائے گی یہ تیری شبعی شام کے بعد

اس کی شعری خدمات پر پنجاب سرکار نے اُسے شرومنی انعام سے نوازا تھا۔اس کی کئی غزلیں، کئی موسیقاروں کے آواز میں صدا بند ہوئی ہیں۔جگجیت سنگھ کی آواز میں اس کی ایک غزل شام کے بعد، کافی مقبول بھی ہوئی۔
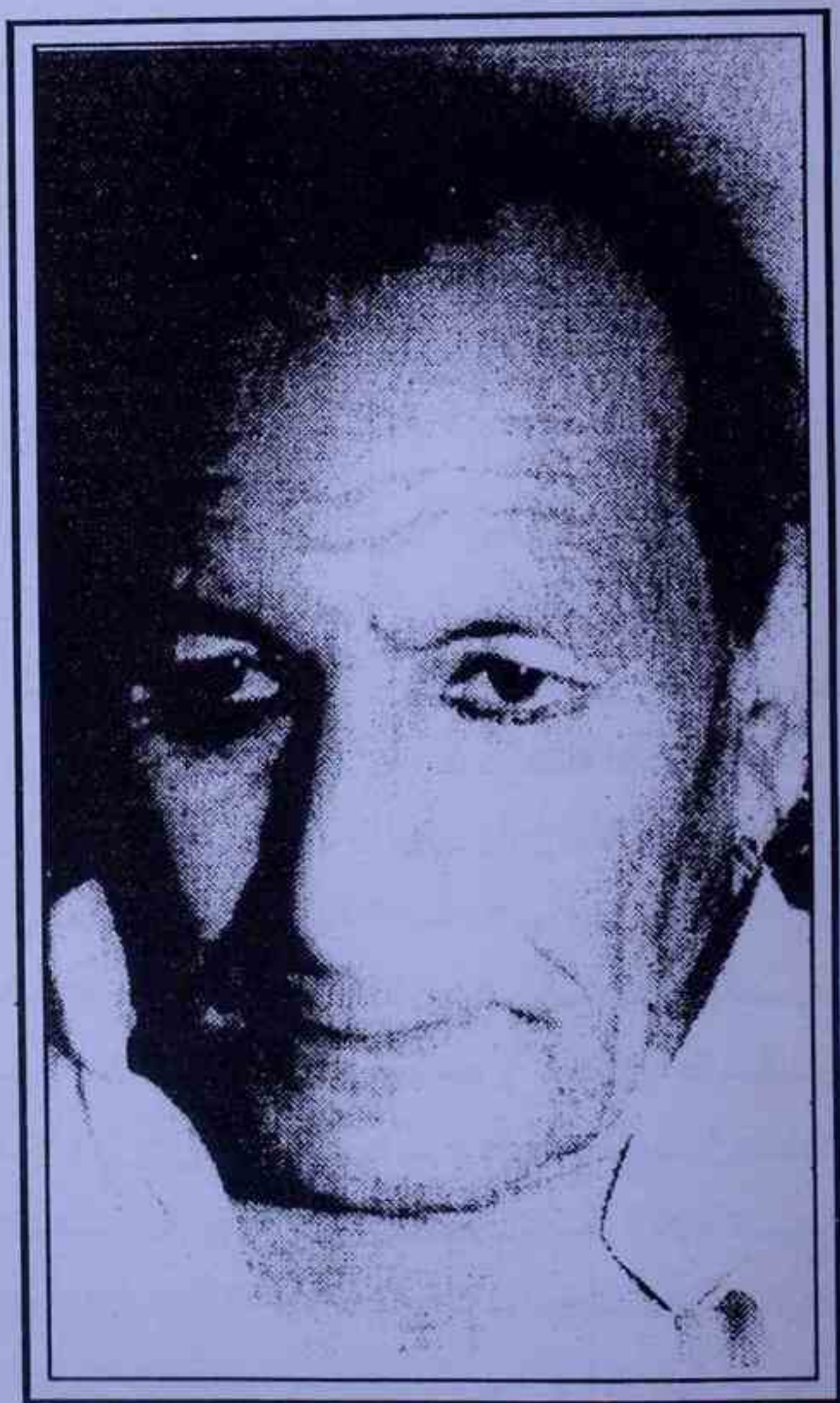
کیف بھوپالی

کیف بھوپالی

میں امراوتی کے قریب بڈنیرہ اسٹیشن پر ممبئی کی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی لیٹ تھی۔ میں وقت گذاری کے لیے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ ایک جانی۔ پہچانی مترنم آواز خاموشی میں گونج رہی تھی۔ بے چہرہ یہ آواز مجھے قلیوں، فقیروں اور تانگے والوں کے اس مجمع کی طرف لے گئی۔ جو سردی میں ایک الاؤ جلائے بیٹھے تھے اور ان کے بیچ کیف بھوپالی مستی میں جھوم جھوم کے انہیں غزلیں بھی سنا رہے تھے اور اپنی بوتل سے ان کی تواضع بھی کر رہے تھے۔

کیف بھوپالی (پیدائش ۱۹۱۷ رحلت ۱۹۹۱) ایک درویش صفت شاعر تھے۔ یہ درویش صفتی ان کے رہن سہن کا ڈھنگ تھا اس کا ان کی شاعری سے کوئی تعلق نہیں تھا ان کا گھر تو بھوپال کے ایک محلے میں تھا لیکن ان کا بستر، کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان ملک کے دور پاس کے ہر شہر میں تھا۔ ہر شہر کے راستے مکان اور چھوٹے بڑے شہری انہیں اپنی ہی بستی کا سمجھتے تھے۔ مشاعروں کے مقبول شاعر تھے۔ جہاں جاتے تھے معاوضہ کا آخری پیسہ خرچ ہونے تک وہ وہیں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ایک مشاعرہ سے دوسرے مشاعرہ کا درمیانی وقت وہ یوں ہی گذارتے تھے۔ ان کی اپنی کمائی شراب اور شہر کے ضرورت مندوں کے لئے ہوتی تھی باقی کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اُسی میزبان کی ہوتی تھی۔ جو مشاعرہ کا منتظم ہونے کے ساتھ ان کا مداح بھی ہوتا تھا۔

آواز اچھی تھی۔ مخصوص ترنم میں شعر سناتے تھے۔ شعر سناتے وقت' آواز کے ساتھ پورے جسم کو ادائیگی میں شامل کرتے تھے۔ جس مشاعرہ میں آتے تھے بار بار سنے جاتے تھے۔ ہر مشاعرہ میں ان کی شناخت کھادی کا وہ سفید کرتا پاجامہ ہوتا تھا جو خاص طور سے اس مشاعرہ کے لیے کسی مقامی کھادی بھنڈار سے خریدا جاتا تھا۔ ان کے لباس کی شفافیت ایک بار مشہور شاعر مخمور سعیدی کو کھل گئی۔

بہار کے ایک علاقہ گریڈیہہ کا مشاعرہ تھا۔ کیفؔ صاحب حسب دستور اسٹیج پر سب سے آگے بیٹھے تھے۔ اور ہر شاعر کو جہاں بیٹھے تھے وہیں سے ایک فٹ اٹھ کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اور گردن کو ہلا ہلا کر داد دے رہے تھے۔ مخمور سعیدی ان کی نشست سے ۴۵ کے زاویہ میں ان کے پیچھے اپنی دھن میں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ مشاعرہ میں شاعروں کی خاطر مدارات کا ذمہ کن مانگہ کے ایک بڑے بیوپاری کے ذمہ تھا۔ اس نے شراب کباب کے علاوہ، سب کو اچھی برانڈ کے سگرٹ پیکٹ بھی دیئے تھے۔ مخمور نے اس کرم فرمائی کو جلد ہی راکھ بنا دیا۔ پانچ سو پچپن کا پورا پیکٹ جب ختم ہوگیا تو انہوں نے اس میں سوراخ کر کے اپنا پیک دان بنا لیا۔ لگاتار پان کھا کھا کر اس میں تھوکتے رہے۔ اور پھر نہ جانے انہیں کیا سوجھی' نشانہ باندھ کر اس بھرے ہوئے پیکٹ کو کیفؔ صاحب پر اچھال دیا۔ کیفؔ صاحب کا کرتا پان کی پیکوں کے داغوں سے بھر گیا۔ کیفؔ نے اس حرکت پر مڑ کر مخمورؔ کو دیکھا اور بنا کچھ بولے خاموشی سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

مخمورؔ کی اس نشیلی گستاخی پر مشاعرہ میں کیفؔ کے مداح جو ہر مشاعرہ کی طرح یہاں بھی کافی تعداد میں تھے' چراغ پا ہو گئے۔ انہوں نے مخمورؔ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کیفؔ صاحب نے جب حالات کو دست وگریباں ہوتے دیکھا تو وہ اپنے کرتے کو بھول کر مخمور کی وکالت کرنے لگے انہوں نے مخمور کا ہاتھ پکڑا اور اپنے ناراض مداحوں سے غصہ میں کہنے لگے۔

'یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہ ہم شاعروں کی بات ہے آپ کو اس میں مداخلت کرنے کی کوئی

ضرورت نہیں، آپ اپنی نشستوں پر واپس جائیے اور مشاعرہ کو خراب ہونے سے بچائیے۔ مخمور میرا بھائی ہے اس سے ہاتھا پائی کریں گے تو مجھے بھی اس لڑائی میں مخمور کی طرف سے شامل ہونا پڑے گا"

کیفؔ صاحب کا بدلا ہوا رخ دیکھ کر سارا مجمع بکھر گیا۔ ان کے جانے کے بعد اندر مشاعرہ پھر سے شروع ہو گیا اور اسٹیج سے باہر کیفؔ نے مخمور سے لپٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میرے بھائی تو تو مشاعرہ باز نہیں ہے اچھا شاعر ہے۔ پھر تو نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ اب میں ایسی حالت میں کیا خاک مشاعرہ پڑھونگا۔ اس وقت تو شہر میں ساری دوکانیں بند ہو چکی ہونگی۔ کہاں سے کرتا پاجامہ خریدوں میں! تو نے میرا مشاعرہ غارت کر دیا۔ تو نے مجھ سے یہ کب کی دشمنی نکالی ہے۔"

مخمورؔ نے ان کی شکایت پر اپنے آنسو پوچھتے ہوئے کہا۔ "بھائی میں شرمندہ ہوں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ نہ جانے کیوں آپ کے کپڑوں کی شفافیت میری آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔"

مشاعرہ کے منتظم نے ان مکالموں کو سن کر، اپنے گھر سے نیا کرتا پاجامہ منگوا کر کیفؔ صاحب کو پیش کیا اور کیفؔ صاحب نے اسی لباس میں مشاعرہ پڑھا۔ مشاعرہ میں کلام سنانے سے پہلے انہوں نے کہا۔ صاحبان پہلے کلام اور لباس دونوں میرے ہوتے تھے۔ لیکن آج صرف کلام میرا ہے۔ اس لئے آج میں پہلے جیسا نہ پڑھ پاؤں تو معاف فرمائیں۔ انہوں نے اس وقت جو غزل سنائی تھی وہ یوں تھی۔

ترے ہوتے جسے فکر شراب و جام ہے ساقی
وہ رندِ خام ' رندِ خام ' رندِ خام ' ہے ساقی
اذاں ہونے کو ہے جام و صراحی سے چراغاں کر
کہ وقت شام، وقت شام وقت شام ہے ساقی

گھٹا چھائی ہوئی ہے، تو خفا ہے، رند پیاسے ہیں
یہ قتلِ عام قتلِ عام قتلِ عام ہے ساقی
مری قسمت کی مجھ کو کب ملے گی میں یہ کیوں سوچوں
یہ تیرا کام تیرا کام تیرا کام ہے ساقی

کیفؔ بھوپالی مشاعروں کے باشعور شاعر تھے۔ وہ عام روش سے ہٹ کر شعر کہنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کی لفظیات بھی عام روایتی ڈھنگ سے مختلف ہوتی تھی۔ اردو کے ساتھ فارسی اور عربی سے بھی وہ بجا طور پر واقف تھے۔ قران حکیم کے دو پاروں کا منظوم ترجمہ بھی انہوں نے کیا تھا۔ جو شائع بھی ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ شعلہ گل (۱۹۷۱) کوئے بتاں (۱۹۶۳) اور آہنگ کیف (۱۹۹۳) کے نام سے ان کے تین شعری مجموعے بھی شائع ہوئے تھے۔ لیکن ان کی شہرت ان کتابوں سے زیادہ مشاعروں کی وجہ سے تھی۔ وہ چھپنے چھپانے اور تبصروں کے لئے رسائل میں کتابیں بھیجنے کے قائل نہیں تھے مشاعروں کی داد و تحسین نے انہیں کبھی رسائل کی طرف نہیں آنے دیا۔ کوئی سن سنا کر چھاپ دیتا تھا تو اور بات تھی۔ کمال امروہوی نے بھی امروہہ کے ایک مشاعرہ میں سن کر ہی انہیں فلمی گیت لکھنے کی دعوت دی تھی۔ ان کے گیتوں کی پہلی فلم دائرہ تھی۔ اس میں موسیقار جمال سین کی طرز میں ان کا لکھا ہوا گیت

دیوتا تم ہو میرا سہارا
میں نے تھاما ہے دامن تمہارا

اپنے زمانہ میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس فلم کے بعد وہ کمال امروہوی کے پسندیدہ شاعر بن گئے تھے۔ وہ جب بھی کوئی نئی فلم شروع کرتے تھے اس میں ایک یا دو گیت ان سے ضرور لکھوائے جاتے تھے۔ کیفؔ صاحب کا کوئی مستقبل پتہ نہیں تھا۔

وہ جب تک جس شہر میں ہوتے تھے وہیں کا کوئی گھر یا ہوٹل انکا پوسٹل ایڈریس ہوتا تھا۔ اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے کمال امروہوی نے اپنے عملہ میں ایک آدمی کو مقرر کیا ہوا تھا۔

اس کا کام صرف کیفی صاحب کے بدلتے ہوئے ٹھکانوں کا پتہ لگانا ہوتا تھا۔ فلم کے شروع ہوتے ہی وہ لمبے چوڑے ملک میں جہاں ہوتے تھے وہاں سے بلوائے جاتے تھے۔ کمالستان کے ایک کمرہ میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ نہلائے جاتے تھے نئے لباس ان کے لئے سلوائے جاتے تھے ایک دو خدمت گاران کی نگرانی پر لگائے جاتے تھے۔ قریب کی ایک دو دو کانوں میں ان کی شراب کے کھاتے کھلوائے جاتے تھے۔ اس اہتمام کے ساتھ ان سے گیت لکھوائے جاتے تھے۔ خاطر مدارات کا یہ سلسلہ گیتوں کے مکمل ہونے تک بدستور جاری رہتا تھا۔ جب گیت ریکارڈ ہو جاتے تھے تو پھر وہ معاوضہ کے ساتھ جہاں جانا چاہتے تھے رخصت کر دیے جاتے تھے۔ کمال صاحب کی یہ وضعداری ان کی آخری فلم "رضیہ سلطان" تک جاری رہی۔

کیفؔ صاحب نے کمال صاحب کی فلموں میں کئی کامیاب گیت لکھے تھے۔ ان میں وہ گیت بھی شامل تھے۔ جو فلم میں کمال امروہوی کے نام سے شامل ہوتے تھے۔ فلم شنکر حسین میں ان کا گیت

انتظار کی شب میں چلمنیں سرکتی ہیں
چونکتے ہیں دروازے سیڑھیاں دھڑکتی ہیں

یا فلم پاکیزہ میں

چلو دلدار چلو، چاند کے پار چلو
ہم ہیں تیار چلو

جیسے گیتوں کی مقبولیت نے فلم انڈسٹری میں ان کے لئے نئی راہیں ہموار کر دی تھیں۔ انہیں کئی آفر بھی ملے۔ لیکن انہوں نے منظور نہیں کئے اور کرتے بھی کیسے کمال صاحب جیسی اردو تہذیب انہیں دوسروں کے یہاں نہیں ملی وہ گیت سے زیادہ پریت کے رسیا تھے۔

کیفؔ نے بھوپالی کے جس ادبی ماحول میں ہوش سنبھالا تھا، وہ بہ یک وقت کئی معتبر آوازوں کا گہوارہ تھا۔ ان میں ذکی وارثی محوی صدیقی، منیر بھوپالی، مائل نقوی، سہا مجددی اور حامد

سعید خاں جیسے اساتذہ بھی شامل تھے۔ یہ شعرا غزلوں کے جاگیردارانہ مزاج کو اپنے اپنے ڈھنگ سے بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بازاری شوخیوں نے گھریلو سنجیدگیوں میں ڈھلنا شروع کر دیا تھا۔ کیفؔ کا گھر بھی شاعرانہ تھا۔ ان کی والدہ بھی شاعرہ تھیں۔ بزرگوں کی صحبت اور وراثت کے شعور نے ان کی شعری ذہانت کی تہذیب کی تھی ان کی شروع کی شاعری میں روش عام سے گریز اور رائج لفظیات سے پرہیز نمایاں ہے۔ اس میں بڑی حد تک کھڑی بولی کے اس روپ کو اپنایا گیا تھا جس کی ایک جھلک آرزوؔ لکھنوی کے مجموعہ سریلی بانسری میں نظر آتی ہے۔ کیفؔ کی شعری زبان اردگرد کی مانوس اشیاء سے تراشی گئی ہے۔ اس کا روپ رنگ زمینی ہے۔ ان کے کئی شعر محاوروں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ان کا شعری انداز ان کے بعد بشیر بدر کے یہاں زیادہ رچاؤ اور خوبصورتی کے ساتھ ابھرتا نظر آتا ہے۔

ایک کمی تھی تاج محل میں
میں نے تری تصویر لگا دی

گل سے لپٹی ہوئی تتلی کو گرا کر دیکھو
آندھیوں تم نے درختوں کو گرایا ہوگا

میکشو آگے بڑھو بادہ کشو آگے بڑھو
اپنا حق مانگا نہیں جائے ہے چھینا جائے ہے

کھیل یہی سیکھا تم نے لڑکپن سے
جو بھی ملا شیشہ توڑ دیا چھن سے

کیفؔ اس دور کے بھوپال کے اثرات کے تحت عقیدتاً ترقی پسند ضرور تھے۔ مگر مزاجاً وہ عاشق مزاج تھے اور وہ بھی کھلے انداز کے۔ ان کی شاعری کا وہ حصہ جو ان کے اس مزاج کی عکاسی کرتا ہے نئی فنکاری کے ساتھ ابھرتا ہے جہاں وہ مشاعروں کی ضرورتوں کو نباہتے تھے تو شاعری

نعرہ بازی بن کر ا کبری ہو جاتی تھی۔ ان کی شاعری کا زیادہ حصہ مشاعرہ بازی کا شکار رہا ہے اپنے دیگر معاصرین کی طرح انہوں نے اس میں شعری جادو کم جگایا اسے ذریعہ روزگار زیادہ بنایا۔ ان کی شاعری کا زیادہ رقبہ ایسے ہی شعروں پر مشتمل ہے......

کیف ہم نے دیکھے ہیں دور دور کے لڑکے
لیکن اچھے لگتے ہیں رام پور کے لڑکے

ہم ترستے ہی ترستے ہی ترستے ہی رہے
وہ فلانے سے فلانے سے فلانے سے ملے

اچھی شعری ذہانتوں پر مشاعرہ کی وقتی دادو تحسین کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے شاعر سے وابستہ توقعات کس طرح بجھ جاتی ہیں، کیف بھوپالی اس کا کھلا آئینہ ہے۔
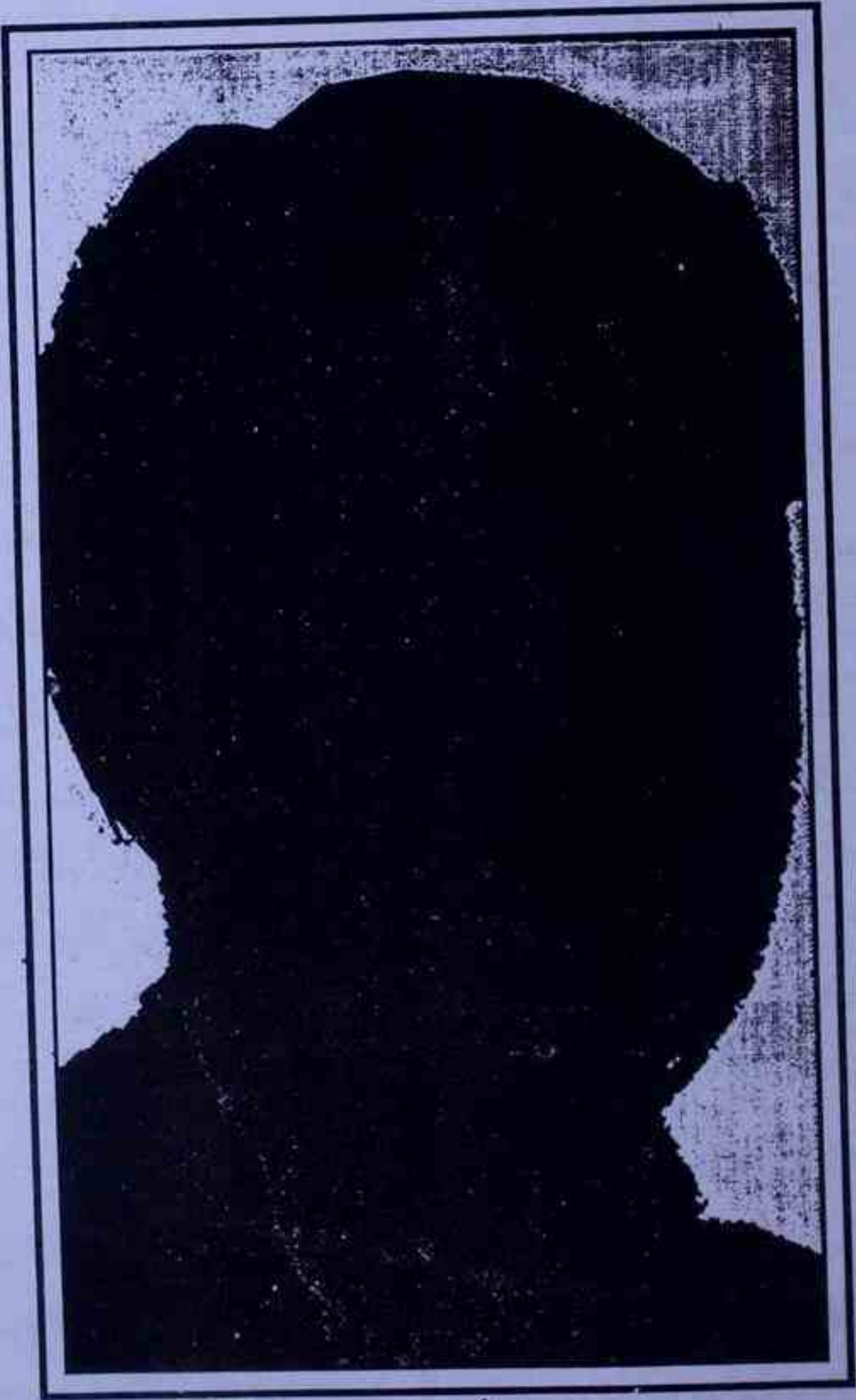
ریاض جیوری

ریاض جیوری

آج سے باون سال پہلے تک گوالیار ایک خود مختار سندھیا ریاست تھی۔ جیواجی راؤ اس کے حکمراں تھے۔ اس ریاست کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں پرائمری اسکولوں میں ہر صبح پڑھائی شروع ہونے سے پہلے ایک دعائیہ نظم پڑھی جاتی تھی جس اسکول میں، میں تھا اس میں تیسری جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے سارے لڑکے ایک کھلے میدان میں سر جھکائے کھڑے ہوتے تھے۔ تین خوش گلو لڑکے اس دعائیہ نظم کو گاتے تھے باقی کورس میں شامل ہوتے تھے۔ اس نظم کا آخری شعر یوں تھا۔

شان و شوکت سندھیا دربار کی قائم رہے
یہ حکومت چاند سورج کی طرح دائم رہے

اس دعائیہ نظم کے شاعر ماسٹر ریاض تھے جو ریاض جیوری کے تخلص سے مشہور تھے۔ وہ ان دنوں پرائمری اسکول سے ترقی کر کے شہر سے ذرا دور شہر کے اکلوتے ہائی اسکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے۔ پرائمری اسکول حضورات سے آٹھویں پاس کر کے میرا داخلہ بھی اس اسکول میں ہوا تھا۔

گول گورا چہرہ، میانہ قد آنکھوں پر پتلی کالی کمانیوں کا گول چشمہ بھرا ہوا جسم چوڑے پائچوں کا ٹخنوں سے اوپر کا پاجامہ گرمی میں کسی موٹے کپڑے کا سوتی کوٹ جاڑے میں اسی کوٹ کے نیچے روئی کی بنڈی اور ہاتھ میں ایک چھتری جو گرمی سردی برسات میں ہر وقت ساتھ ہوتی

تھی، چلنے میں یہ چھڑی کا کام کرتی تھی جب کھلتی تھی تو دھوپ اور پانی سے سر کی حفاظت کرتی تھی۔
ریاض صاحب اتنی دنیا دیکھ چکے تھے کہ اب چلنے میں سوائے زمین کے کچھ اور دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کوئی آواز دے کر ٹوکتا تھا تو ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے کہیں دور دراز کے علاقے سے آ رہے ہوں ٹوکنے والے کے لئے وہ رُکتے نہیں تھے اسے خود ان کے ساتھ ہم قدم ہونا پڑتا تھا۔ ان کی رفتار نہیں بدلتی تھی۔ ان کے ساتھ جو ہوتا تھا اُسے انہیں کے قدموں کے حساب سے اپنی چال میں کمی بیشی کرنی پڑتی تھی۔

ریاض صاحب (پیدائش ۱۸۹۹ء) کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد جیور (یوپی) کے ایک زمین دار خاندان کے فرد تھے۔ نام حسام الدین تھا۔ شاعری گھربار کی فکر سے پورے طور پر بے فکر تھی اسی لئے 'آزاد' تخلص کا انتخاب کیا تھا۔ تخلص کی رعایت سے زندگی میں بھی ضرورت سے زیادہ آزاد طبع تھے۔

ریاض صاحب کو بچپن سے ہی زندگی نے آنکھیں دکھانا شروع کر دی تھیں۔ وہ جیور (بلند شہر کا ایک علاقہ) چھوڑ کر اٹاوہ آ گئے۔ اٹاوہ میں اسلامیہ ہائی اسکول میں تعلیم شروع کی۔ یہاں ان کے ہم جماعتوں میں انہیں کے ہم عمر ایک طالب علم تھے جو ان کے دوست بن گئے تھے۔ ان کا نام ذاکر حسین تھا جو بعد میں ہندوستانی تاریخ میں صدر مملکت ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے جانے گئے۔

اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں ذاکر حسین اپنی مقرری اور ریاض صاحب اپنی شاعری سے طلباء میں نمایاں تھے۔ وقت کے ساتھ ریاض قاضی انصاری کی شاعری اسکول ٹیچری تک آ کر ٹھہر گئی" اور ذاکر حسین کی مقرری سیاست کی عظمت بن کر نکھر گئی۔ دونوں کے حالات میں بھی کافی فرق تھا۔ ریاض صاحب غم روزگار کے مارے تھے۔ ذاکر صاحب اچھے گھرانے کے ستارے تھے: گھریلو ماحول کے فرق نے دونوں کی سمتوں کا تعین کیا۔ ذاکر تعلیم کے لئے ملک سے باہر روانہ ہو،

یہ اپنے دیس میں ہی شکارِ زمانہ ہوئے۔ انہیں کا شعر ہے۔

حیات غمگیں کی تلخیوں کو اسی طرح خوشگوار کرلوں

خوشی نہیں ساز گار مجھ کو : تو غم کو ہی ساز گار کرلوں

ریاض صاحب نے بڑے سلیقے سے اپنے غموں کو ساز گار کیا۔ وہ غموں سے ہارے نہیں غموں کو مسلسل ہرا کر زندگی کرتے رہے تعلیمی سلسلہ غم روزگار سے منقطع ہونے کے بعد بھی جاری رہا۔ ملازمت میں رہتے ہوئے انہوں نے پہلے بی اے کیا' پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پہلے اردو میں پھر فارسی میں ایم اے کیا۔ لیکن ان ڈگریوں کے باوجود وہ پرائمری اسکول سے ہائی اسکول کی مدرسی تک ہی پہونچ پائے آگے نہیں بڑھ پائے۔ ان کی اس سست رفتاری میں ان کے مزاج اور ان اقدار کا دخل زیادہ تھا جو انہیں ہمیشہ عزیز رہیں۔

ایک دفعہ ذاکر صاحب نائب صدر ہندستان کی حیثیت سے گوالیار آئے تھے۔ ان کے وہاں مختصر قیام کے دوران ان سے ملنے والوں کی جو سرکاری فہرست بنائی گئی تھی اس میں ماسٹر ریاض کا نام بھی تھا۔ اس فہرست میں ایک اجنبی نام کا اضافہ ذاکر صاحب نے خود اپنی قلم سے فرمایا تھا۔ ریاض صاحب ان سے ملے۔ ذاکر صاحب نے ان سے جب پوچھا قاضی صاحب آپ اتنی ڈگریوں کے ساتھ ابھی تک اسکول کے ٹیچر کیوں ہیں۔ آپ فرمایئے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں''۔ ذاکر صاحب حکومت ہندوستان کے ایک اہم رکن تھے۔ ان کے ایک اشارے سے ریاض صاحب کی ڈگریوں پر وقت کی جو دھول پڑی ہوئی تھی۔ وہ صاف شفاف ہو کر کسی بڑے ادارہ کی زینت بن سکتی تھیں لیکن ریاض صاحب نے ان کی کرم فرمائی کے جواب میں مختصراً اتنا ہی کہا۔

''میرے لیے آپ صرف اتنا کردیجئے۔ کہ اردو زبان جو آزادی کے بعد سیاست کے نرغے میں ہے اسکی حفاظت فرمائیں۔ میری خواہش ہے میری زندگی تک یہ خوبصورت زبان

وراثت کے طور پر نئی نسل کو ملے۔ میں تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا، لیکن وہ بچے جو میرے بعد آئیں وہ اس زبان سے محروم نہ ہو جائیں۔

پتہ نہیں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے درد کا ازالہ کیا یا نہیں، لیکن ریاض صاحب اپنے محدود وسائل اور دائرہ میں اس کا علاج ضرور کرتے رہے۔ وہ صبح سے شام تک ایک گھر سے دوسرے گھر تک بھٹکتے رہتے۔ طالب علموں کی رہنمائی فرماتے رہتے، بچوں کو اردو پڑھانے کے لئے والدین کو سمجھاتے رہتے، ادبی محفلیں سجاتے رہتے، دوسروں کو شاعر بناتے رہتے، لہک لہک کر اپنے اشعار سناتے رہتے۔ انہیں کا شعر ہے:

عمل میں اب یہ فریادیں بدل جائیں تو اچھا ہے
یہ آہیں جہد کے سانچے میں ڈھل جائیں تو اچھا ہے

ریاض صاحب نوح ناروی کے ممتاز شاگردوں میں تھے۔ شعر ترنم میں سناتے تھے اور پہلے مصرع سے ہی ہنگامہ مچاتے تھے۔ آواز اچھی تھی۔ ترنم میں آج کل کی طرح گائکی یا فلمی دھنوں کی آمیزش نہیں تھی۔ ان کا ترنم تسبیح کے دانوں جیسی چھوٹی چھوٹی گولائیاں بناتا ہوا مصرع کو اختتام تک پہونچاتا تھا۔ پورا مصرع اس طرح ایک سانس میں ادا کیا جاتا تھا۔ دوسرے مصرع میں پہلے لفظ سے ہی اونچے سروں میں رکتی بڑھتی گولائیاں قافیہ پر آ کر ٹھہر جاتی تھیں ردیف بولتی ہوئی ہوتی تھی اسے ساری محفل دہراتی تھی۔ بولتے ہوئے قافیے اور کھنکتی ہوئی ردیف ان کے شعری اسکول کی خصوصیات میں تھیں۔ جب داد سے محفل پر شور ہوتی تھی تو وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر سلام کرتے رہتے تھے۔ اور جب شعر تھمتا تھا تو پھر پورے شعر میں سے صرف قافیہ اور ردیف کو ترنم سے دوبارہ سناتے تھے اور دوسرا شعر اسی سانس میں اٹھاتے تھے۔

وہ ہر مشاعرہ میں شروع میں نوح صاحب کے دو تین شعر تبرکاً ضرور پڑھتے تھے۔ نوح صاحب کے شعروں کی سادگی، برجستگی اور فارسی تراکیب سے آزاد شعری زبان سے ساری محفل جھوم اٹھتی تھی۔ جب اس طرح ماحول بن جاتا تھا تو ماسٹر ریاض کا کلام بھی سامعین کو گرماتا تھا۔

امیر و داغ کے شاگردوں کا ایک وصف اپنے استادوں کے رنگ کلام کی تقلید بھی تھا۔ ہر شاگرد اپنے کلام کو استاد کے کلام سے ہم رنگ کرنے کو شاعری کا معیار سمجھتا تھا۔ داغ اور امیر کی روایت جو تین چار شعری نسلوں سے گذر کے اولاد حسین تو پہ، سکھ دیو پرشاد بسمل، دعا ڈبائیوی ریاض جیوری زیبا ناروی، عزیز سلونوی بال کرشن موج تک پہونچی تھی ان میں سب ہی اپنے اپنے مزاج کے مطابق پیروی استاد کرتے نظر آتے ہیں یہ اور بات ہے یہ پیروی کلام کے خارجی روپ کی ہوتی ہے، الفاظ کے پیچھے جو شخصیت کارفرما ہوتی ہے۔ وہ اس تقلیدی رویہ میں شامل نہیں ہو پاتی۔ لیکن ادب میں اس روایت نے زبان و بیان کی خوش سلیقگی سیدھے رواں مصرعوں کی خوش آہنگی زبان کی ڈرامائی شائستگی کو ضرور زندہ رکھا ہے، جن سے آج کے ہکلاتے ہوئے لہجے اور لفظوں کے غیر غنائی جھٹکے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ریاض صاحب کے اس قسم کے شعر ہیں۔

لطف نہیں، سکوں نہیں، چین نہیں خوشی نہیں
یہ بھی ہے کوئی زندگی، یہ کوئی زندگی نہیں

مانا کہ جور حد سے سوا کیجئے گا آپ : جب یہ بھی کر چکیں گے تو کیا کیجئے گا آپ

شب ماہ میں گھر سے نکلو نہ باہر اویرے سویرے اکیلے دوکیلے
کہیں ہو نہ جائیں تصدق ستارے، کہیں چاند رخ کی بلائیں نہ لے لے
ادھر خوف انہیں اپنی رسوائیوں کا ادھر ڈر ہمیں اپنی بدنامیوں کا
پڑے یاد کرتے ہیں اک دوسرے کو ادھر وہ اکیلے ادھر ہم اکیلے

اس رنگ کی شاعری کے ساتھ بعد میں ان کے کلام میں بدلتے ہوئے سماج اور سیاست کے رسم و رواج بھی در آئے تھے لیکن یہ ان کے یہاں شعوری تبدیلیوں کی طرح تھیں ان کی شعری طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں۔ انہوں نے خود بھی کہا ہے۔

ہر چند اب بدل گئی طرز غزل ریاض
میں اپنے ذوق و رنگ طبیعت کو کیا کروں

اس رنگ ڈھنگ کی غزل کی محبوبہ اکثر بازار حسن کی زینت ہوتی تھی۔ حیدرآباد میں تو داغ کی محفل آرائی کے لئے بہ یک وقت کئی طوائفیں ملازم تھیں۔ ان کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد بھی اس شعری روایت کے تحت ''غزل کے لئے بازار حسن کی سیر وسیاحت کو جائز سمجھتے تھے۔ ریاض صاحب بھی جب اٹاوہ سے منتقل ہوکر گوالیار کے کسی قصبہ میں برسر روزگار تھے تو گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے کسی حسن بالائے بام کے شکار تھے۔ ان کے مخالفین نے ان کی اس جسارت کی شکایت حکومت تک پہونچادی۔ اسکول کے استاد کی یہ حرکت قابل ملامت سمجھی گئی۔ جب یہ شکایت ملازمت کے لئے خطرہ بن گئی تو ماسٹر ریاض نے اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے سرٹیفکٹ لے کر پیش کردیا۔ اس سرٹیفکٹ میں تصدیق کی گئی تھی کہ وہ طبی لحاظ سے معذور ہیں اور عورت اور مرد کے جنسی رشتے سے قدرتی طور پر دور ہیں۔ یہ جھوٹا سرٹیفکٹ جو نوکری بچانے کے لئے تیار کیا گیا تھا ماسٹر ریاض نے اسے سچ بنا کر زندگی بھر نبھایا۔

مہاتما بدھ نے صاحب اولاد ہونے کے بعد سچائی کی خاطر سنیاس لیا تھا۔ انہوں نے بے اولاد ہوکر ملازمت کی خاطر جسمانی بن باس لیا تھا۔ اولاد کی اس جبریہ محرومی نے شہر کے سارے بچوں کو ان کی اولاد بنادیا تھا۔ اسکول میں غریب طالب علموں کی اسکول کی فیس سے لے کر ان کی کاپی پینسل کتابوں اور کپڑوں کے اخراجات بھی ان کی محدود تنخواہ سے پورے ہوتے تھے۔ ریٹائرمینٹ کے بعد بھی ان کی یہ تعلیمی رشتہ داریاں یونہی جاری رہیں۔ ان کا گھر جو ایک سادے سے کچے وارنڈے اور ایک کمرہ پر مشتمل تھا رات دن پڑھنے لکھنے والے لڑکے لڑکیوں سے بھرا رہتا تھا۔ ریاض صاحب کی بیگم ذرا اونچا سنتی تھیں۔ ان کی صحبت میں ریاض کو بھی اونچی آواز میں بات کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ان کی اس عادت سے باہر بیٹھے ہوئے مہمانوں کو ان کے کہے بغیر گھر کے اندر کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ اور وہ اکثر ریاض صاحب کے باہر آنے سے پہلے

بنا چائے پیئے رخصت ہو جاتے تھے۔ ان کا راشن، دودھ اور چائے کی پتی کا بڑا حصہ ان لڑکے لڑکیوں پر خرچ ہوتا تھا جو ان سے بنا کسی معاوضہ کے پڑھنے آتے تھے۔ ان کی خاطر مدارات میں ریاض صاحب کی اہلیہ بھی ہر وقت مصروف نظر آتی تھی ان کی شفقتیں مٹھائی یا ملائی بن کر مجھے بھی اکثر لبھاتی تھیں۔

ریاض صاحب شاعر ہونے کے ساتھ علم الحساب کے بھی ماہر تھے۔ انہیں پانچ ہزار تک کے پہاڑے یاد تھے۔ کوئی بھی پہاڑا جیسے ۴۷۱۳ یا ۳۳۴ یا اور کوئی پوچھ لیجیے وہ برقی مشین کی طرح فوراً فر فر سنا دیتے تھے۔ بڑے سے بڑے حساب کو وہ فوراً زبانی بتا دیتے تھے۔ اپنی اس مہارت کا استعمال انہوں نے اپنی زندگی کے نفع نقصان میں کبھی نہیں کیا۔

۹ جولائی ۱۹۷۴ء کے روز یہ خوش گلو شاعر اردو کا پرستار، طلباء کا خیر خواہ، اپنے پرائے سب کا ہمدرد ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا وہ چلے گئے لیکن ان کے گھر کے سامنے کی چھوٹی سی مسجد، اس کے برابر کھڑے جامن کا پیڑ، وراندے میں پڑے بڑے لکڑی کے دو تخت اور شہر کے بہت سے طالب علموں کے ساتھ وہ اب بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور مسکراتے ہوئے سمجھاتے ہیں۔

جنگ ظلمت سے رہے گی میرے نورِ فکر کی
میں چلا جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی
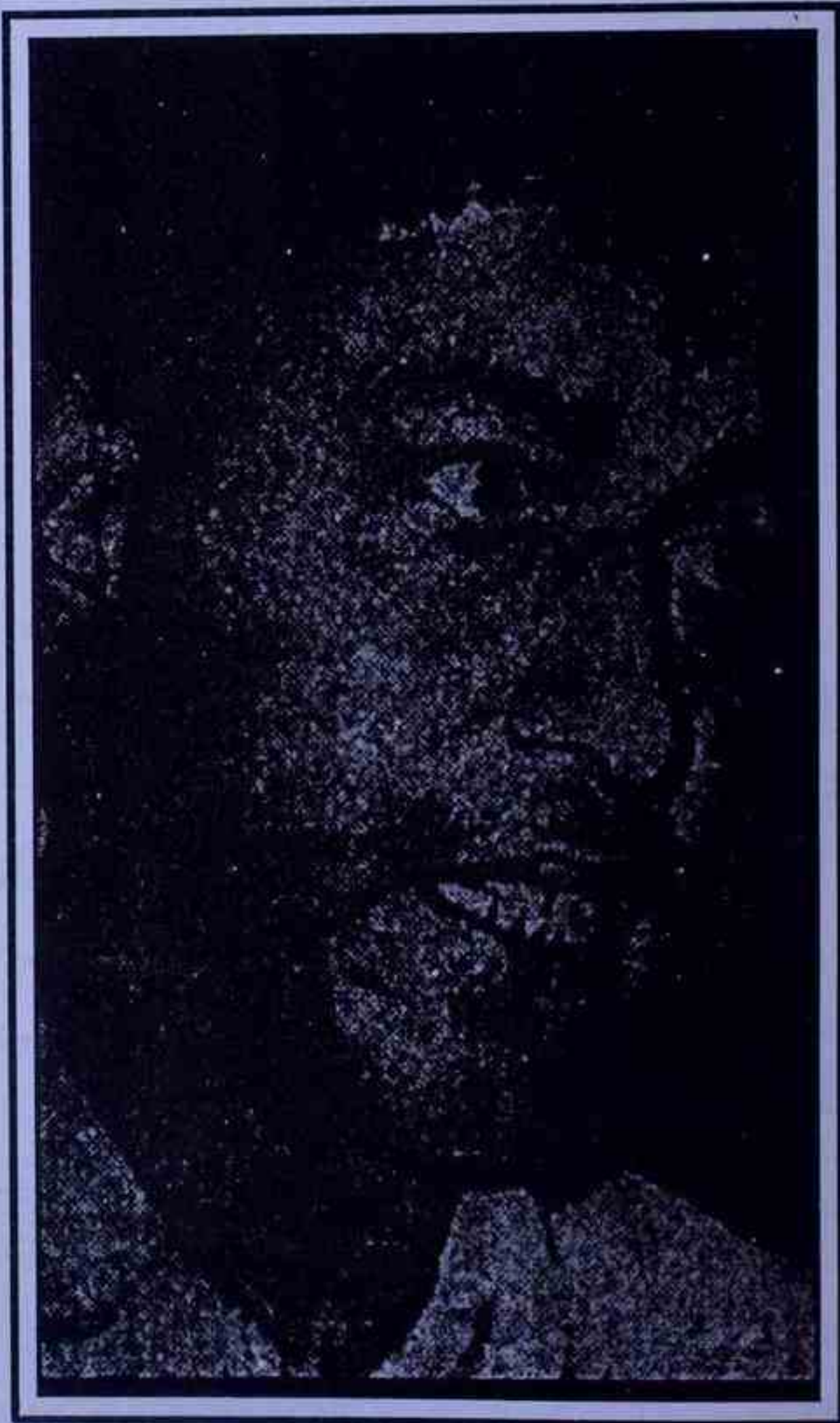
شمیم فرحت

شمیم فرحت

میں کون ہوں؟ کیا ہے میری ولدیت؟ بتایئے!

یہ سوال تیس پینتیس سال پہلے ایک سرد رات کو غصہ بھری ایک جوان آواز میں گوالیار کے ایک محلے کے گھر میں سنے تھے۔ جب سے اب تک میری یادداشت میں محفوظ ہیں۔ جب بھی یہ ذہن کے نہاں خانوں سے باہر آتے ہیں تو کمپیوٹر کی طرح ایک پوری فائل کھل جاتی ہے۔

ماسٹر ریاض اور دعا ڈبائیوی کی شاعری کا گوالیار۔ لمبے پورے قد اور کھلتے ہوئے رنگ کی فاطمہ زبیر۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے کئی قصے۔ ان قصوں میں رومان اور ہیجان۔ سندھیا دربار سے وابستہ زیب النساء رات کو دیر دیر تک روشن راتیں۔ رستوں چوراہوں پر مسلسل باتیں، اندھیری گلیوں کی ملاقاتیں!

لیکن شراب پیے ہوئے غصہ بھری آواز میں ان سوالوں کا تخاطب ادھیڑ عمر کی ایک خاتون فاطمہ زبیر سے تھا۔ وہ ایک مقامی گرلس اسکول میں اردو کی ٹیچر تھیں۔ اس اسکول کا نام موجودہ جیواجی راؤ سندھیا کی بہن کملا راجہ کے نام پر کملا راجہ گرلس اسکول تھا۔ اور اس سوال کو پوچھنے والا ایک نوجوان شاعر تھا۔ عمر انیس بیس کی، کھڑے نقشہ کا گورا چٹا، مضبوط ہاتھ پاؤں کا خوبصورت جوان، اس کا نام شمیم فرحت تھا۔ فاطمہ زبیر جن کو شہر میں سب فاطمہ آپا کہتے تھے اس شاعر کی والدہ تھیں۔ بڑی بڑی سنجیدہ آنکھیں، کھڑا ایرانی نقشہ، گیہواں رنگ اور گھونگرالے بالوں

اور سرو قد کی اس خاتون کے شجرہ میں تیسری نسل پیچھے غالبؔ و ذوقؔ کے ہم عصر مومنؔ خاں مومن کا نام درج تھا۔ نہایت آزاد مزاج اور گوالیار کے ادبی سماج کی ایک فعال اور باشعور شخصیت تھیں۔ خود تو شاعر یا ادیبہ نہیں تھیں لیکن ان کا دابی ذوق اور مطالعہ ایسا تھا کہ شہر کے چھوٹے بڑے شاعر و ادیب ان کی تعریف و تنقید کو سند کا درجہ دیتے تھے۔ بڑی شگفتہ اور بامحاورہ اردو بولتی تھیں۔ اسکول میں استانی تھیں اس لئے ہر مسئلہ کو دلیل کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر سلجھاتی تھیں۔ وہ جس کے کلام پر گردن ہلا دیتی تھیں' اسے دوسری نظروں میں معتبر بنا دیتی تھیں۔ وہ دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کی ذمہ دار ماں تھیں۔ ان دنوں وہ اپنے گھر کی ماں اور باپ دونوں تھیں بیٹیاں حنیفہ اور عفیفہ پڑھ لکھ کر اپنے گھروں کی ہوگئی تھیں۔ دونوں بیٹے ایک دو سال کے فرق سے شہر کے نوجوان شاعر تھے۔ بڑے کا نام نثار پرویزؔ تھا اور چھوٹے کو شمیم فرحتؔ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شمیم فرحتؔ میرے دوست تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے تھوڑے بڑے تھے۔ لیکن شہر میں وہ اکیلے شاعر تھے۔ جو میرے مزاج کے قریب تھے۔ دن میں ایک دو بار ان سے ضرور ملاقات ہوتی تھی۔ گورا رنگ، ہر وقت ہنستا مسکراتا چہرہ اور ذہانت سے چمکتی آنکھوں کا یہ شاعر جہاں بھی جاتا تھا لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا تھا۔ اس زمانے میں ایک بڑے گھر کی ایک خوبصورت لڑکی سے اس کے پوشیدہ عشق کے چرچے بھی لوگوں کی زبان پر تھے۔ لیکن یہ عشق یک طرفہ تھا یا دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی، یہ راز کبھی افشاء نہیں ہوا۔

فاطمہ آپا زبیر احمد نامی ایک شخص کی اہلیہ تھیں۔ لیکن وہ جاں نثار کی دوستی سے زیادہ مشہور تھیں۔ اس کا ذکر صفیہ اختر کے ان خطوں میں تحریر ہے جو انہوں نے شادی سے پہلے اپنے ہونے والے شوہر جاں نثار کو لکھے تھے۔ صفیہ کے شادی سے پہلے اور بعد کے خطوں کو جاں نثار نے دو جلدوں میں شائع کیا تھا۔ حرف آشنا اور زیر لب کے نام سے۔ خطوں کے یہ دو مجموعے ایک سوانحی ناول سے مماثل ہیں۔ صفیہ اختر ایک تنقیدی کتاب کی مصنفہ، علی گڑھ کے زمانہ سے جاں نثارؔ کی محبوبہ اور بعد میں ان کی اہلیہ تھیں۔ ان کتابوں میں مختلف کرداروں کے ذریعہ بیسویں صدی کے

ایک بڑے حصہ کو حصار میں لیا گیا ہے۔ اس میں مرکزی کردار تو صفیہ اور جاں نثار کے ہی ہیں۔ لیکن ان کے ارد گرد جو دوسرے چھوٹے بڑے کردار اور واقعات ہیں وہ بھی کم اہم نہیں ہیں فاطمہ آپا بھی انہیں بہت سوں میں ایک دلچسپ کردار ہیں۔ ان مجموعوں کو اور دلچسپ بنانے کے لئے ان میں جو تعارفی دیباچے شامل کئے گئے ہیں انہیں بھی فاطمہ زبیر سے منسوب کیا گیا ہے۔ فاطمہ آپا کے شجرہ میں شامل مومن خاں مومن کا شعر ہے۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

صفیہ اختر کو فاطمہ زبیر اور جاں نثار کے رشتہ کا علم شادی سے پہلے بھی تھا۔ اور شادی کے بعد بھی انہوں نے اسے ایک معاہدہ کے تحت قبول کر لیا تھا۔ جاں نثار کے والد مضطر خیر آبادی کا ایک مشہور شعر ہے۔

تمہیں چاہوں تمہارے چاہنے والوں کو بھی چاہوں
مرا دل پھیر دو مجھ سے یہ سودا ہو نہیں سکتا

مضطر صاحب مرد تھے۔ اور صفیہ اختر عورت۔ بہو میں سسر جیسی جسارت کیسے ممکن تھی۔ اس لئے انہوں نے جب جاں نثار کو چاہا تو ان کے چاہنے والوں کو بھی خندہ پیشانی سے سراہا۔ خطوں کے ان دونوں مجموعوں میں محبت کے اس تثلیثی رشتوں کے نشانات نمایاں ہیں

میں نے زبیر صاحب کو نہیں دیکھا وہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے شہر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ گوالیار کے بزرگوں کی زبانی سنا ہے۔ وہ سیدھے سادھے عملی آدمی تھے۔ اپنے گھر بچوں اور نوکری تک ان کی دنیا محدود تھی۔ نہ وہ فاطمہ آپا کی طرح ادبی ذوق رکھتے تھے۔ نہ ان کی طرح محفلوں میں آنے جانے کا شوق پالتے تھے۔ جب انہیں جاں نثار سے فاطمہ آپا کی خفیہ ملاقاتوں کا علم ہوا تو ایک دن بیوی کو اتہ پتہ دیے بغیر غائب ہو گئے۔ بہت تلاش کیا گیا مگر کوئی سراغ نہیں ملا۔ گھر والے صبر کر کے خاموش ہو گئے۔ شہر والوں نے ان کی یادوں پر فاتحہ پڑھ لی۔ کافی عرصہ

گذر جانے کے بعد جب فاطمہ آپا جوان سے بوڑھی ہو چکی تھیں۔ جاں نثار گوالیار چھوڑ کر بھوپال میں بس چکے تھے، دونوں بیٹیاں بڑی ہو کر اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں لڑکے جوان ہو کر شاعر بن چکے تھے تو وہ اپنی خودساختہ موت کے اندھیروں سے باہر آ کر اپنی بڑی بیٹی عفیفہ کے یہاں جاوزہ میں خدا ساز موت کے حوالے ہونے چلے آئے۔ اور ہمیشہ کے لئے اپنی رقابت کی ناراضگی کو اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو گئے۔ فاطمہ زبیر نے ان کے نام پر ہاتھوں کی چوڑیاں توڑیں اور عدت کے دن پورے کیے۔ میرا ایک شعر ہے۔

بے وفا تو نہ وہ تھے نہ ہم

یوں ہوا بس جدا ہو گئے

جاوید اختر اور سلمان اختر کی طرح نثار پرویز بھی صفیہ کے خطوں کے مجموعوں میں ایک کردار ہیں۔ وہ ان کتابوں میں کئی جگہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں پڑھائی سے لاپرواہی کے ذیل میں کہیں فاطمہ زبیر اور جاں نثار کے رشتے کے تحت اور کہیں کسی ادبی محفل کے سیاق وسباق میں۔ نثار پرویز کی ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ صفیہ اور جاں نثار کے ساتھ بھوپال میں رہے۔ سن سینتالیس کے بعد۔

نثار پرویز اپنی چال ڈھال اور روپ رنگ سے جوانی کے دنوں کے جاں نثار سے ملتے جلتے تھے۔ وہی آدھی سوئی آدھی جاگی آنکھیں وہی درمیانی قد اور بکھرے بکھرے بال، وہی ہنستے ہونٹوں کے کھلنے اور سمٹنے کا انداز۔ شعر سناتے وقت بھی ان پر اختر صاحب کا دھوکا ہوتا تھا۔ انہیں دیکھ کر پنجابی کی مصنفہ امرتا پریتم کی ایک کتاب رسیدی ٹکٹ یاد آ جاتی تھی۔

امرتا پریتم نے اپنی سوانح میں ایک جگہ لکھا ہے۔ جب ان کے لڑکے نے ان سے پوچھا کہ اس کا چہرہ ساحر سے اتنا کیوں ملتا ہے؟ کیا وہی اسکے باپ ہیں؟ تو امرتا جی نے جواباً کہا، نہیں یہ سچ نہیں ہے۔ تمہاری شباہت ساحر سے شاید اس لیے ملتی ہے کہ جب تم میرے پیٹ میں تھے تو اس وقت ساحر میرے دماغ میں رہتا تھا۔

شمیم فرحت کی شباہت تو نثار پرویز کی طرح اختر صاحب سے نہیں ملتی تھی۔ ان کی جسمانی ساخت اور چہرہ مہرہ فاطمہ آپا جیسا تھا وہ اپنے بھائی کی طرح ان خطوں میں بھی کہیں نہیں تھے۔ مگر جاں نثار سے ان کا تعلق پسند و ناپسند کی کشمکش کا شکار تھا وہ ہوش میں جاں نثار کے مداحوں میں تھے۔ ان کی شاعری کے دھیمے رومانی اور تصویری لہجہ سے متاثر بھی تھے۔ کوئی جاں نثار کی شاعری پر انگلی اٹھاتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتے اپنے حوالوں اور دلیلوں سے ان کی شاعری اور ترقی پسندی پر توصیفی تبصرہ فرماتے۔ اتنے پر بھی اگر کوئی قائل نہیں ہوتا تو اسے قائل کرنے کے لئے تندرست ہاتھ پاؤں کی طاقت آزماتے۔ شہر میں ان کی کئی لڑائیوں کی وجہ جاں نثار تھے۔ اگر کوئی طاقت آزمانے سے بھی باز نہیں آتا تھا تو وہ اسے شناساؤں کی فہرست سے نکال دیتے تھے۔

لیکن سورج غروب ہونے کے بعد وہ مختلف شخصیت بن جاتے تھے۔ دن کے اجالوں کے ممدوح کو رات میں وہ اپنے چبھتے ہوئے سوالوں کا ہدف بناتے تھے ان پر طرح طرح کے الزام لگاتے تھے اور اپنی ماں کو رلاتے تھے۔ یہ ڈرامہ وہ ہفتہ میں دو تین بار ضرور کرتے تھے۔ اس ڈرامہ کو اسٹیج کرتے وقت وہ اپنے پرائے کا بھی خیال نہیں کرتے تھے۔ ان کا مقصد صرف ماں کو ستانا ہوتا تھا۔

گوالیار آنے سے پہلے وہ جاورہ (موجودہ مدھیہ پردیش کا علاقہ اور آزادی سے پہلے کی ایک نوابی ریاست) میں اپنی بہن کے ساتھ تھے۔ وہیں سے انہوں نے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کھلتا ہوا رنگ چوڑا سینہ غلافی آنکھیں اور اونچے پورے قد کے اس شاعر کا تعارف اس کے شہر میں آنے سے پہلے ماہنامہ جمالستان دہلی اور شمع میں شائع شدہ ان کی نظموں اور غزلوں سے ہو چکا تھا۔ فلمی رسالے ہوں یا ادبی اس زمانہ میں شائع ہونا آج کی طرح آسان نہیں تھا۔ رسائل سے ہی ادبی معیارات طے ہوتے تھے۔ شمیم فرحت کی ایک غزل کے شعر ان دنوں جمالستان میں نمایاں طور پر شائع ہوئے تھے۔

تمہاری یاد کی ٹھنڈک بھگو رہی تھی ابھی
ندی کے پاس کہیں شام ہو رہی تھی ابھی

وہ زندگی جسے سمجھا تھا قہقہہ سب نے
ہمارے پاس کھڑی تھی تو رو رہی تھی ابھی
کھنک رہا تھا کوئی جسم میرے لفظوں میں
تمہارے نام کی تعریف ہو رہی تھی ابھی

گوالیار میں ان کی آمد ان دنوں کے مقامی نئے شاعروں کے لئے ایک اہم ادبی واقعہ تھا۔ شمیم کے شعر پڑھنے کا انداز کافی پراثر تھا۔ تحت میں پڑھتے تھے لیکن شعر کو مناسب جگہوں پر روکتے ہوئے آواز کے اتار چڑھاؤ سے کیفیت پیدا کرتے تھے۔ آواز بارعب اور سدھی ہوئی تھی۔ جس نشست یا مشاعرہ میں شامل ہوتے۔ سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتے تھے۔ کبھی جسمانی وجاحت سے کبھی ادائیگی کی انفرادیت سے شراب کا شوق جاورہ سے لے کر آئے تھے۔ ان کی شراب نوشی نے انہیں اُن دنوں ہم عمروں کا ہیرو بنا دیا تھا۔ ان دنوں کھلے عام شراب پینا رسم ورواج کے خلاف احتجاج کی علامت تھا جو نئے ذہنوں کو بھاتا تھا۔ وقت کے ساتھ اس شوق میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور پھر جلد ہی وہ وقت بھی آیا جب شراب اور شمیم فرحت لازم وملزم ہوگئے۔ کبھی تانگے میں، قمیض کے سارے بٹن کھولے دکھائی دیتے کبھی بیچ رستے میں نشے میں کسی ادبی موضوع پر الجھتے نظر آتے۔ اس شراب میں دوسروں کو متوجہ کرنے کی ادا زیادہ تھی۔ فاطمہ آپا کی حیات تک جو شراب سورج کے غروب ہونے پر ہی طلوع ہوتی تھی اب چاند سورج کے فرق کو بھول چکی تھی۔ فاطمہ آپا کی بیماری کے دنوں میں کچھ دن اس لت میں اعتدال پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن ان کی رحلت کے بعد جب وہ انہیں کے اسکول میں انہیں کی جگہ پرنیچر ہوگئے تھے تب اسکول کے اوقات کو چھوڑ کر وہ باقی کا وقت اسی شغل کے لئے وقف کر چکے تھے۔ ماں کے انتقال کے بعد۔ حالانکہ بڑا بھائی نثار پرویز اسی شہر میں تھا لیکن وہ اس کے ساتھ نہ رہ کر شہر سے دور ایک پہاڑی پر ایک مکان میں اکیلے رہنے لگے تھے۔ وہیں یار دوستوں کی محفلیں سجاتے تھے۔ دوسروں کے کلام پر اصلاح فرماتے تھے۔ جھوم جھوم کر اپنے نئے شعر سناتے تھے۔ اور دیر تک آس پڑوس کی نیندیں اڑاتے تھے۔

سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار عوامی دور میں نمایاں طور پر انہیں چھاپتے تھے یہ ان دنوں بڑی اہمیت کی بات تھی۔ اس کے علاوہ دیگر معتبر رسائل میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہتا تھا۔ باہر کے مشاعروں میں بھی بلائے جاتے تھے۔ لیکن نہ کبھی بیاض رکھی نہ رسالوں کے تراشے محفوظ ہوئے۔ اور نہ کوئی مجموعہ ان کی حیات میں شائع ہوا۔ پیدائش کا سال ۱۹۳۴ تھا زندگی کے ۵۱ سال پورے کر کے ۱۹۸۵ میں ۹ راگست کی ایک رات کی جب صبح ہوئی اور جب صبح دوپہر اور بعد میں شام میں تبدیل ہوئی تو گھر میں مرے ہوئے پائے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ایک دوست رام پرکاش ترپاٹھی نے اپنی یادداشت اور گھر میں ملے کچھ کاغذ کے پرزوں سے ان کا ایک مختصر سا مجموعہ دیوناگری میں 'دن بھر کی دھوپ' کے نام سے شائع کیا تھا۔ ان میں ۳۹ غزلیں اور سولہ نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ کا نام انہیں کے ایک مطلع سے لیا گیا ہے۔

وہ آدمی ہے رنگ کا خوشبو کا دھوپ کا
کیسے مقابلہ کرے دن بھر کی دھوپ کا

نیاز فتح پوری نے ایک بار ماہنامہ نگار میں ایک طرح دے کر کئی شاعروں کی غزلیں شائع کی تھیں۔ ان میں شمیم فرحت کے بھی دو شعر شامل کیے گئے تھے

گلشن کی حد باندھنے والے کیا نادانی کرتے ہیں
رُت کے بدلتے ہی ہریالی جنگل تک آجاتی ہے

صرف ذرا سی بھول سے فرحت چولہے کی اک چنگاری
آنگن تک آئے نہ آئے آنچل تک آجاتی ہے

نیاز فتح پوری کے کڑے انتخاب میں ان کے دو شعروں کا شامل ہونا، ان کے شاندار شعری مستقبل کی بشارت تھا۔ لیکن اس بشارت کے مکمل ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے سلا دیا۔ شمیم فرحت ایک ذہین شاعر تھے۔ لیکن ان کی ذہانت کو انکی نفسیاتی پیچیدگی نے پنپنے نہیں دیا۔ ان کے کلام کا تھوڑا سا حصہ دیوناگری میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ بھی ان کا کہا ہوا بہت کچھ تھا۔ جو ابھی تک تاریکی میں ہے۔
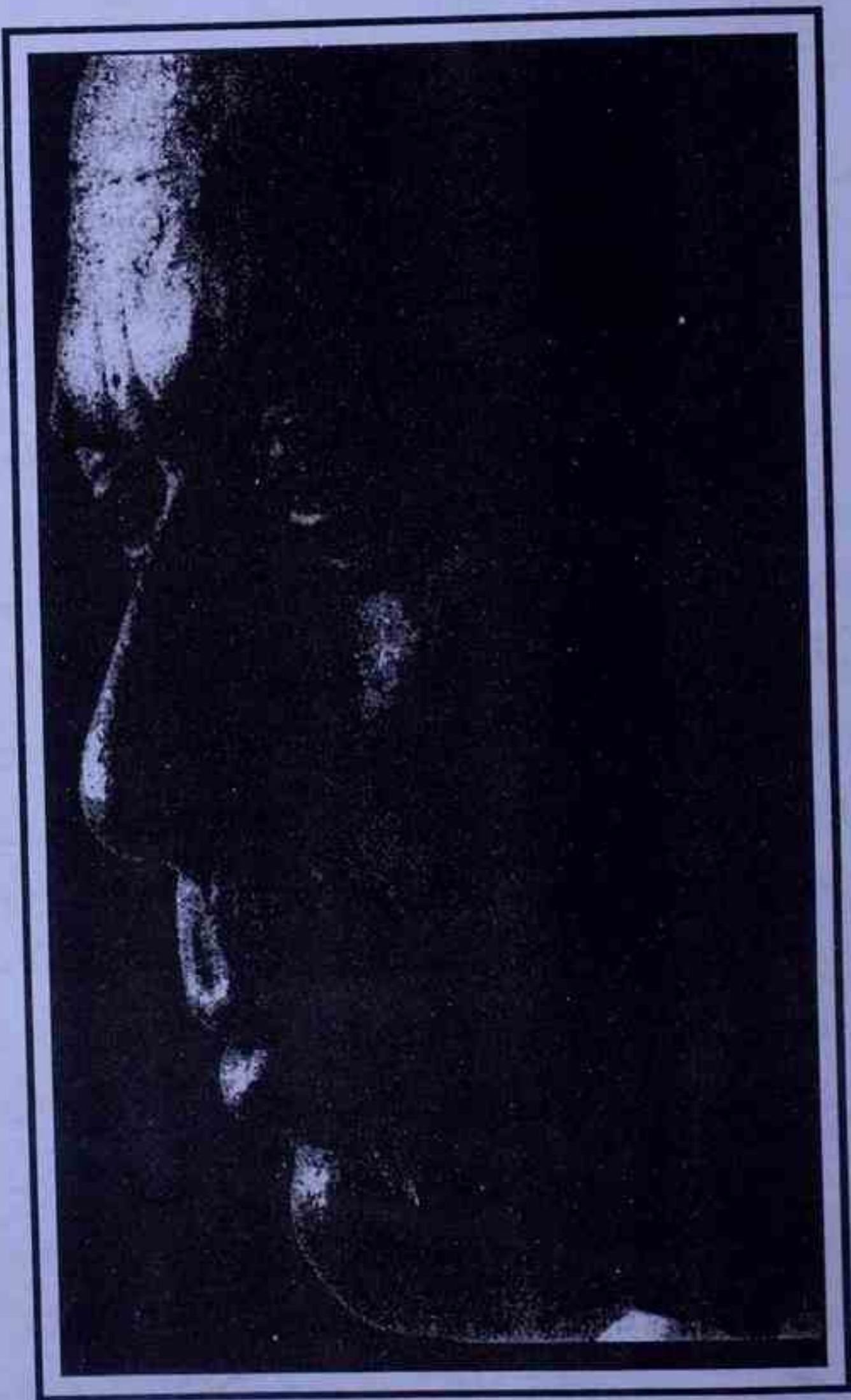
صابر دت

گُل بھوشن صابر دت

کچھ لوگ ادب کے حوالے سے جانے جاتے ہیں، اور کچھ اپنے کردار کی رنگارنگی سے ادب میں پہنچانے جاتے ہیں۔ گل بھوشن کے صابر دت ہو جانے کا کردار ایسا ہی تھا۔ وہ خوجی، ظاہر دار بیگ یا عصمت کے دوزخی کی طرح کسی قلم کی تخلیق نہیں تھا اپنے کردار کا خود خالق تھا۔ ممبئی آنے سے پہلے وہ صابر دت بن چکا تھا۔ اس نے اپنا تخلص اپنے عہد کی دو مشہور شخصیتوں کے ناموں سے تراشا تھا۔ ایک تھے ساحر لدھیانوی جن کے تخلص میں بہ قول اس کے رومن کے H کو B سے بدل کر اس نے صابر بنایا تھا۔ دوسرے فلموں کے ہیرو سنیل دت تھے، جن کے سرنیم کو اس نے صابر کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔ وہ بہ یک وقت دونوں کا پرستار تھا اور دونوں کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی رشتہ دار تھا۔ صابر ممبئی میں دہلی سے آیا تھا۔ دہلی میں چنڈی گڑھ سے اور چنڈی گڑھ میں بچپن کی کچی عمر میں سری نگر سے ہجرت کر کے تھا۔ سری نگر میں اس کے والد پولس افسر تھے جو اپنے نام کی وجہ سے کسی قبائلی کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اوائل عمری میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے، وہ ساری عمر، جب جب جہاں جہاں رہا، دوسروں میں اپنے باپ کو ہی تلاش کرتا رہا۔ یہ تلاش کا طویل سفر جو چنڈی گڑھ میں کشمیری لال ذاکر کی قیام گاہ سے شروع ہوا تھا۔ ممبئی میں ساحر کی بلڈنگ پرچھائیاں میں ساحر کی بہن سرور شفیع تک آکر ختم ہوتا ہے۔ سرور شفیع اس کی یتیمی کی آخری سرپرست تھیں۔ صابر نے فن اور شخصیت کے اشعار میں اپنی اس آخری سرپرست کو یوں یاد کیا ہے۔

ساحر کی بہن آپا سرور شفیع نے، میرے علاج کے لئے پیسے کا منہ نہیں د ۲۴ گھنٹے

ساتھ رہیں اور ساٹھ ہزار روپے میری بیماری پر خرچ کر دیے۔ آج کے نفانفسی کے زمانہ میں کون یہ سب کسی کے لئے کرتا ہے۔"

فاصلوں کے شہر ممبئی میں صابر ایک واحد شخص تھا جو مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کو ایک دوسرے سے قریب کیے ہوئے، تھا کون کس کے بارے میں کیا سوچتا ہے؟ کون کس سے ناراض ہے؟ کس کی اپنے بارے میں کیا رائے ہے، ادب میں شہرت کے لئے کون کیسے ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے؟ یہ ساری معلومات، اس کے ذریعے گھر بیٹھے ملتی رہتی تھیں۔

وہ ایک ایسا چلتا پھرتا کیمرہ تھا جس کی رسائی ہر چھوٹے بڑے گھر میں مردانے سے زنانے تک تھی۔ اس کے اس طرز عمل سے، لوگ باگ آپ ہی آپ ایک دوسرے سے ناراض اور خوش ہوتے رہتے تھے۔ روتے جھگڑتے رہتے تھے لیکن ادبی دنیا میں صابر کی مقبولیت ان معاصرانہ اتار چڑھاؤ سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔ وہ کرشن چندر سے جاوید اختر اور سردار جعفری سے ندا فاضلی تک سب کا ہم راز اور اپنا تھا۔ اس کی اس ہر دل عزیزی میں اس کی گپ بازی کی معصومیت دوسروں کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے کی عادت، اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے کی شرافت کا بڑا دخل تھا۔ وہ ان خصوصیات کی بنا پر ادیبوں اور شاعروں کی عادت بن چکا تھا۔ اور اس عادت کے چھوٹے بڑے سارے ادیب و شاعر شکار تھے۔

صابر دت اکیلا تھا۔ نہ اس کے کوئی آگے تھا نہ پیچھے۔ اس کی ماں کافی عرصہ پہلے ساتھ چھوڑ چکی تھی، ایک بہن بھی تھی لیکن وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی اس کی اطلاع شاید صابر دت کو بھی نہیں تھی۔ یہ بھی ممکن ہے جیسی تنگ زندگی وہ جی رہا تھا اس میں رشتے ناتوں کی گنجائش نکالنا مشکل ہو۔ لیکن اس کی تنہائی دوسروں کی طرح اکیلی نہیں تھی۔ ممبئی میں ہر ادیب کا گھر اس کا گھر تھا۔ ہر شاعر سے اس کی رشتہ داری تھی، اردو زبان سے وابستہ ہر شخص اس کا اپنا تھا۔ اس کی دوستیاں، دشمنیاں، رقابتیں، شکایتیں، دوریاں نزدیکیاں سب اسی دائرہ میں تھیں۔ سلمیٰ صدیقی نے روزنامہ انقلاب میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا۔

اکثر لوگوں کو صابر دت کی نیت پر شبہ ہوتا ہے۔ کسی کا خیال ہے صابر دت ادیبوں کو لڑواتا ہے، کوئی کہتا ہے صابر دت شاعروں کو جھگڑواتا ہے، کوئی سمجھتا ہے صابر دت شہرت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہے۔ لیکن یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ صابر یہ سب کچھ نہیں کر رہا۔ وہ تو بس اردو کا دیوانہ ہے۔"

اُس کی دیوانگی کا ثبوت فن اور شخصیت کے وہ بھاری بھرکم نمبر ہیں، جو صابر دت کی تنہا محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ ان نمبروں کی کتابت طباعت، اشاعت سے لے کر مالی وسائل کی فراہمی تک صرف اسی کی جدوجہد کے کارنامے ہیں۔ ان خصوصی نمبروں کا سلسلہ جو مہندر ناتھ یادگار نمبر (مارچ ۱۹۷۵) سے شروع ہوا تھا۔ بعد میں جاں نثار نمبر، فیض احمد فیض نمبر کملیشور نمبر، قتیل شفائی نمبر، غزل نمبر، آپ بیتی نمبر، نرگس دت نمبر، مقبول شعراء نمبر، اشعار نمبر، گنیش بہاری طرز نمبر اندر کمار گجرال نمبر اور آخر میں صابر دت نمبر ۱۹۹۹ تک مسلسل جاری رہا۔ 'صابر دت نمبر' صابر کی زندگی کی آخری ادارتی کاوش تھی۔ اس نمبر میں ہندوپاک کے بیشتر معتبر لکھنے والوں نے صابر دت کی شاعری اور اس کی ادارتی صلاحیتوں کو سراہا ہے۔

غالب نے اپنے ایک خط میں بہادر شاہ ظفر کے شاعر ہونے پر شک وشبہ کا اظہار کیا ہے، مولانا محمد حسین آزاد بھی ان کی رائے سے اتفاق کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود ظفر کی شاعری اردو تاریخ کا حصہ ہے۔ صابر دت کی شاعری بھی ایسا ہی قصہ ہے۔ اس میں کون کتنا ہے؟ جس کا بھی جتنا ہے یہ بحث اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ہے اس کے نام سے تین شعری مجموعے منسوب ہیں۔ ایک دہلی میں شائع ہوا تھا پل دو پل کے نام اور بعد کے دو موج عارض اور شجر اکیلا ممبئی میں چھپے تھے۔ ان مجموعوں میں کئی رنگ اور اصناف کی بہار ہے۔ غزل نظم قطعات، نثری نظم و آزاد نظم! ان میں وہ کہیں روایت کا پاسدار نظر آتا ہے کہیں جدت کا طرفدار نظر آتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی لہجہ یا رنگ نہیں ہے لیکن وہ ہر انداز میں اپنی آواز ڈھالنے کے ہنر سے واقف محسوس

ہوتا ہے۔

صحنِ گلشن میں لے نہ انگڑائی
آرہی ہے بہار آنے دے

ذکر جب بھی کسی محفل میں چھڑا ہے اپنا
اجنبی بن گئے اور جا کے الگ بیٹھ گئے

پڑھ رہے ہیں نماز وہ ایسے
جیسے سجدہ خدا، خدا کو کرے

گاؤں سے شہر نیا تھا لیکن
سارے دکھ درد پرانے نکلے

مفلسی ہے جب تلک سنسار ہیں
خوں نظر آئے گا روز اخبار

شمس الرحمٰن فاروقی نے ساحرؔ اور صابرؔ کی دو ہم موضوع نظموں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے۔ ''صابر کی نظم (تاج محل) ساحر کی نظم پر ایک طرح کی طنزیہ تنقید معلوم ہوتی ہے۔ صابر کا بیانیہ بہ مقابلہ ساحر کے جدید زندگی سے قریب تر اور کرب ناک تر ہے''۔

شاید اسی ہمت افزائی کے زعم میں چنڈی گڑھ کے ایک مشاعرہ میں اس نے سردار جعفری کو خاموش کر دیا تھا۔ ہوا یوں، صابر نے مائک پر جیسے ہی نظم کا عنوان 'تاج محل' بتایا۔ جعفری

صاحب نے اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ بھئی کوئی اور نظم سناؤ تاج محل پر تو ساحر کی بہت اچھی نظم ہے۔ صابر کا جواب تھا، جی ہاں میں اسی کے مقابلہ میں اپنی بہتر نظم پیش کر رہا ہوں۔ صابر کی جسارت نے محفل میں نئی حرارت پیدا کر دی۔

صابر سے اس کا کلام سننے کا پہلا اتفاق مجھے اندور کے ایک مشاعرہ میں ہوا تھا، جہاں وہ جاں نثار اختر کے ساتھ آیا تھا۔ ایک بزرگ سردار نہایت خوبصورت لہجہ میں نظامت کر رہے تھے۔ صابر کو بلانے کے لئے انہوں نے اس کے تعارف میں جو کئی جملے بولے تھے ان میں آخری جملہ تھا۔ ''صابر دت مشہور اداکار سنیل دت کے بھائی بھی ہیں''۔ صابر اس وقت جس عالم میں تھا اس میں وہ مشاعرہ میں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور تھا۔ اپنا نام سنتے ہی وہ کہیں اور سے سیدھا مائک پر آیا اور شعر پڑھنے سے پہلے یوں گویا ہوا۔ سردار جی نے غلط کہا، میں سنیل کا بھائی نہیں ہوں، وہ میرا بھائی ہے۔ وہ فلم کا اداکار ہے اور خادم قلم کا فن کار ہے۔ اس کے بعد اس نے کچھ رومانی قطعات سنائے۔ ان میں ایک یوں تھا۔

ہم جو کافر ہیں سب کی نظروں میں
سیڑھیاں مسجدوں کی چڑھتے ہیں
کون جانے تو مل ہی جائے ہمیں
آج ہم بھی نماز پڑھتے ہیں

اس کے پڑھنے کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ وہ ہر مصرعہ کو بھاری آواز میں شروع کرتا تھا۔ لیکن جیسے ہی آخری کے دو لفظوں پر آتا تھا اپنی سیدھی ٹانگ اٹھا کر زور سے اسٹیج پر پٹکتا تھا۔ قطعہ کے تین مصرعے اس طرح ادا کرنے کے بعد جب وہ چوتھے مصرعہ کے لفظ ''پڑھتے ہیں'' پر آ کر ٹانگ اٹھا رہا تھا تو قریب بیٹھے ایک صاحب نے، اسے اس عمل سے روکنا چاہا تو اس کے پڑھنے کی روانی اچانک ہکلاہٹ میں بدل گئی اور وہ خاموش ہو کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ان صاحب نے اسٹیج کے تخت پر، پاؤں کے مسلسل پٹکنے سے جو کھٹ پٹ ہو رہی تھی اسے روکنے کے لئے ایسا کیا تھا،

انہیں شاید معلوم نہیں تھا صابر کے لئے یہ عمل لفظوں کی ادائیگی کیلئے کتنا ضروری تھا۔ یہ ہکلاہٹ شاید بچپن کے خونی حادثہ کی وجہ سے، جس کا وہ عینی گواہ تھا، شروع سے اس کے ساتھ تھی۔ اس حادثہ نے صابر کو تمام عمر بچپن کی سرحد سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ وہ زندگی بھر ڈرا سہا بچہ ہی رہا۔ اس کی ناراضگیاں اور خوشیاں اسی عمر کے روٹھنے اور منائے جانے کی طرح معصوم اور دلچسپ تھیں۔ مجھ سے ناراض ہوا تو میرے خلاف ایک نثری نظم لکھ دی اور شہر میں سب کو سناتا پھرا۔ جب بخار ٹھنڈا ہو گیا تو پھر سے پہلے کی طرح ہو گیا۔ یہ ہی رویہ اس کا مجروح سلطان پوری کے ساتھ رہا۔ غزل نمبر میں اس نے اپنے ادارتی نوٹ ''پڑھنے والوں کے نام'' میں مجروح سے اپنی خفگی کا اظہار یوں کیا تھا۔

مجروح صاحب کے کہنے پر، غزل نمبر میں غالب کی پانچ غزلیں ہیں اور مجروح صاحب کی دس ہیں۔ پرچہ چھپنے کے بعد انہیں ضرور ندامت ہو گی۔

شمس الرحمان فاروقی نے اس کی نظم تاج محل کی تعریف کی تو بہت خوش تھا، پھر نہ جانے کس بات پر ناخوش ہوا کہ ''مقبول شعرا نمبر'' کے انتساب میں لکھا۔

''فاروقی اور وزیر آغا کے نام جنہوں نے خود بھی گنجلک، سپاٹ اور بے کیف شاعری کی اور اپنے رسائل شب خون اور اوراق میں اپنے ہی قماش کے شعراء کی حوصلہ افزائی کر کے اردو شاعری کو خراب کیا''۔

وزیر آغا کا مضمون بھی صابر کی تعریف میں صابر دت نمبر میں شامل ہے۔ ایسا ہی رویہ اس کا دوسروں کے ساتھ بھی تھا۔

صابر اپنے رنگ ڈھنگ کی منفرد شخصیت تھا صحافت سے اس کا تعلق دہلی سے تھا جہاں وہ دیوناگری میں ایک ماہنامہ نکالتا تھا۔ ممبئی میں ادبی صحافت سے اس کی دلچسپی دیوانگی کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ وہ رات دن اسی میں کھویا رہتا تھا۔ اس نے شادی کی نہ اپنے لئے کسی رہائش کا انتظام کیا یوں بھی نہیں ہے اس نے کبھی کسی سے محبت ہی نہ کی ہو۔ ساحر کی طرح اس کی زندگی میں بھی کئی

ناکام محبتیں شامل ہیں۔ ان میں سے دو کو تو کافی شہرت بھی ملی۔ ایک کلکتہ کی خاتون تھیں جو فن اور شخصیت کے شماروں پر مدیر کی حیثیت سے اس کا نام دیکھ کر خط و کتابت کرنے لگی تھیں۔ یہ خط و کتاب بہت جلد ہی مہہ جبیں سے تمہاری جھنبو اور صابر دت سے پیارے ''صبو جی'' بن گئی تھی۔ یہ رشتہ اس وقت ختم ہوا جب دو چار خطوں کے بعد صابر دت کے ہاتھ کی تحریر اچانک بدل گئی۔ صابر دت کبھی خود نہیں لکھتا تھا۔ اس کے لئے لکھنے کا کام ہمیشہ دوسرے کرتے تھے۔ بار بار بدلتے ہوئے ہینڈ رائٹنگ پر لڑکی کو شک ہوا اور اس نے اپنا آخری محبت نامہ ایک پارسل کے روپ میں بھیجا جس میں ایک ٹوٹی ہوئی چپل تھی۔

اس کی داستان میں دوسرا کردار ساحر کی ماموں زاد بہن انور سلطانہ تھی جس نے ساحر کے انتقال کے بعد صابر کے رہنے کے لئے پرچھائیاں میں ایک کمرہ دے رکھا تھا۔ یہ کمرہ کچھ ہی دنوں میں، اپنی رات دن کی خدمات کی وجہ سے، پورا مکان بن گیا تھا۔ انور سے اس کی شادی کی خبر شہر میں گشت کرنے لگی تھی۔ راہی معصوم رضا، سلمیٰ صدیقی اور صابر کے دوسرے خیر خواہ اس نیک کام کی تیاریوں میں تھے کہ اچانک وہ ایک جانکاہ مرض میں مبتلا ہو کر رخصت ہو گئیں۔ صابر کا شعر ہے۔

مدتوں بعد اٹھائے تھے پرانے کاغذ
ساتھ تیرے مری تصویر نکل آئی ہے

صابر کا کلام کئی سنگرس نے اپنے کیسٹوں میں شامل کیا ہے۔ جگجیت سنگھ کی آواز میں اس کی ایک نظم، ''اک نجومی نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے'' کافی مقبول ہوئی تھی......

ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ، بدن پر ساحر کے اسٹائل کی نہرو کٹ واسکٹ، ہونٹوں میں آٹھوں پہر پائپ اور بات بات پر ادیبوں اور شاعروں کے لطیفوں پر قہقہے لگاتا اور ساحر کی قبر پر ہر جمعرات کو پھول چڑھاتا یہ اردو کا غیر مسلم کردار اچانک ایک موذی مرض کا شکار ہو کر دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ شمشان میں ادیبوں شاعروں اور بہت سے دوسروں کی بھیڑ

میں، ماتھے پر بندیا لگائے ایک خاتون بھی تھی جو سب سے دور بیٹھی مسلسل رو رہی تھی۔ وہ صابر دت کی بہن تھی جو تقریباً چالس سال کے بعد اپنے بھائی کا چہرہ دیکھنے پنجاب سے آئی تھیں۔

کوئی نہیں جب ملنے آیا
ہم سے ملنے آئے آنسو

ندا فاضلی، شاعری کی طرح، ادبی دنیا میں اپنی تازہ کار نثر سے بھی پہچانے جاتے ہیں، موضوع چاہے کیسا بھی ہو، ان کا طرز نگارش اسے پرکشش اور قابل توجہ بنا دیتا ہے۔ ان کے لفظوں میں طنز و مزاح کی دلکشی بھی ہے، اور بات سے بات پیدا کرنے کی سنجیدگی بھی ہے۔ ملاقاتیں، دیواروں کے بیچ، دیواروں کے باہر کے بعد یہ ان کی چوتھی نثری کتاب ہے۔ یہ ان کی نثر نگاری کا 'نیا' دلکش اور تہہ دار تجربہ ہے۔ اس کتاب میں (جو ایک کالم کے روپ میں سلسلہ وار روزنامہ انقلاب میں شائع ہو چکی ہے) انہوں نے ان شخصیات کو موضوع بنایا ہے جو کبھی حال کی زینت تھے اور اب ماضی کی امانت ہیں۔ یہ سارے کردار جن کو ندا فاضلی نے الگ الگ وقت میں دیکھا اور سنا تھا، اس دور کی علامتیں ہیں جب ادب اور زندگی کا رشتہ آج کی طرح بازاری اور کاروباری نہیں ہوا تھا۔ مشاعروں کے اپنے آداب ہوتے تھے۔ ان میں شامل ہونے والے شعرا اور ادب کے قارئین کے درمیان وہ فاصلے پیدا نہیں ہوئے تھے، جنہوں نے اب اس ادارہ کو خرید و فروخت کا بازار بنا دیا ہے۔ شعر سنانے والے اور سننے والوں کی ادبی دوریوں نے مشاعروں کے کردار کو نمائشی بنا دیا ہے۔ جس میں ادب کم اور پرفارمینس کا غلبہ زیادہ نظر آتا ہے۔ اکہری صحافت اور وقتی سیاست کے منظوم نامے شاعری کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک فرقہ وارانہ رجحان، جو آہستہ آہستہ مشاعروں میں سرایت کرتا جا رہا ہے وہ بھی کافی تشویش ناک ہے۔ وہ انسانی اقدار جو اردو شاعری کے

بنیادی مزاج میں شامل رہی ہیں، اسٹیج پر پڑھی جانے والی شاعری میں نظر نہیں آتیں۔ مشاعرہ جو کبھی زبان و بیان کا اسکول اور شعری حسن کا پیمانہ خیال کیا جاتا تھا وہ بھی اب بڑی حد تک پیشہ ورانہ روپ میں بدلتا جارہا ہے۔ پیشہ کی اس ضرورت نے شاعروں کی ایک بڑی تعداد کو طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ کچھ اسٹیج کے پیچھے لکھتے ہیں اور کچھ اسٹیج پر کلام سناتے ہیں۔ لکھنے والوں کی، پڑھنے والوں کی کمائی میں حصہ داری ہوتی ہے۔

ندا فاضلی نے اس کتاب میں مختلف کرداروں کی پیش کش میں ان سارے سوالات و خدشات کو نہایت دلچسپ اور پرکشش انداز میں ابھارا ہے۔ ان کا بیانیہ ڈرامائی، تصویری، اور ماحول سازی کے حسن سے آراستہ ہے۔ اس کا بڑا وصف وہ سہل سہج زبان ہے جس میں عوامی بولیوں کا رس بھی ہے اور کھڑی بولی کا جس بھی ہے۔ ندا فاضلی کی نثر ان کے شعری اسلوب کے مانند ایک ایسا لسانی تجربہ ہے جو انہیں کی انفرادیت سے مخصوص ہے۔ اس کتاب میں جن چہروں کو مصور کیا گیا ہے، وہ ماضی و حال کے تضادات کا دائرہ بناتے ہیں۔ ندا فاضلی نے اپنے لفظوں میں جو دکھایا ہے اس میں وہ خود بھی شریک رہے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے ان یادوں کو انہوں نے اس خوبصورتی سے دہرایا ہے کہ گذرا ہوا دور آنکھوں کے سامنے چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔

شاہد ماہلی